معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/ روپے فی شمارہ ۱۲/ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

مضمون نگارانِ معارف

۱۷۳ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۴ء تا ماہ جون ۲۰۰۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست ششماہی

مضامینِ معارف

۱۷۳ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۴ء تا ماہ جون ۲۰۰۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۷۳ ماہ ذی القعدہ ۱۴۲۴ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۴ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ہندو جس طرح سنسکرت کو اپنی مذہبی زبان سمجھتے ہیں اسی طرح عربی کو بھی مسلمانوں کی مذہبی زبان کہتے ہیں لیکن نہ زبان کا کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ وہ کسی مذہب کی ہوتی ہے، البتہ ملکوں اور خطوں کی ہوتی ہے اور جو لوگ اسے بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ان کی ہوتی ہے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، عربی عرب ملکوں کی زبان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عرب میں ہوئی تھی اور آپؐ پر جو آسمانی صحیفہ نازل ہوا وہ عربی زبان میں تھا، جس طرح آپؐ سے پہلے کے نبیوں پر ان کی قوم و ملک کی زبان میں صحیفے نازل ہوئے تھے، انبیا کی زبان وہی ہوتی ہے جو ان کی قوم و ملک کی ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی قوم کی زبان میں خدا کا پیغام واضح طور سے پہنچادیں، عربی کو مسلمانوں کے یہاں تقدس کا درجہ اس بنا پر حاصل ہوگیا ہے کہ اس میں قرآن مجید اور ان کے نبیؐ کے فرمودات اور تعلیمات ہیں اور اسی کو علمائے اسلام نے اپنی تصنیفی زبان بناکر اس میں اسلام کے اصول و مقاصد اور قرآن و حدیث کے احکام کی تشریح کی ہے، چنانچہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس زبان کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اس میں مہارت پیدا کرتا ہے، تاکہ اپنے مذہب سے اس کی واقفیت براہِ راست ہوجائے اور عام مسلمان اسے پڑھنا سیکھتے ہیں تاکہ قرآن مجید کی تلاوت کرسکیں اور نماز اور دوسری عبادات کی ضروری اور مسنون دعاؤں کے کلمات عربی میں ادا کرسکیں خواہ ان کے معنی و مفہوم سے انہیں واقفیت نہ ہو۔

ان ہی وجہوں سے یہ زبان مسلمانوں کو عزیز ہے لیکن وہ عربی پر اپنی اجارہ داری نہیں سمجھتے، عرب ملکوں کے علاوہ دنیا کے اکثر ملکوں کے مسلمان اسے بولتے، لکھتے پڑھتے اور سمجھتے بھی نہیں، اب تو یہ ایک بین الاقوامی زبان ہوگئی ہے، ہر ملک میں اس کی تعلیم ہوتی ہے، مصر و شام اور کئی عرب ملکوں کے غیر مسلم اور یورپ و امریکہ کے فضلا اس زبان کے ماہر اور اس میں تصنیف و تالیف کا کام کررہے ہیں، عربی لغت، نحو، ادب، تاریخِ ادب، سیرت، تاریخ، رجال اور متعدد علوم و فنون میں ان کی تصنیفات ایسی بلند پایہ ہیں جن سے مسلمان عربی داں بھی فایدہ اٹھا رہے ہیں، مستشرقین نے خالص اسلامی علوم اور عربی کے قدیم مسلمان مصنفین کی امہاتِ کتب اپنے فاضلانہ حواشی کے ساتھ شایع کی ہیں لیکن ان ہی مستشرقین کی اکثر تصنیفات اسلام دشمنی کا نمونہ اور مسلمانوں کے خلاف مواد سے بھری ہوئی ہیں، انہوں نے قرآن مجید اور ذات نبویؐ کے خلاف اسی زبان میں ہرزہ سرائی کی ہے، خود

مسلمانوں کے تجدد پسند اہل قلم نے بھی عربی میں اسلام، تاریخ اسلام اور ذات نبویؐ کے متعلق گمراہ کن باتیں لکھی ہیں، ظاہر ہے یہ سب کچھ عربی میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کا مذہبی سرمایہ تو نہیں، عرصے تک سنسکرت اس قاعدے سے مستثنیٰ رہی مگر اب اس پر بھی ہندوؤں کی اجارہ داری ختم ہوچکی ہے۔

ہندوستان میں اردو کو صاف صاف مسلمانوں کی مذہبی زبان تو نہیں کہا جاتا مگر اب یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہوگئی ہے، اردو اخباروں میں حال ہی میں ماہنامہ آج کل کے سابق سب اڈیٹر جناب نند کشور وکرم کا ایک مضمون اسی کے متعلق شایع ہوا ہے اور اس پر بڑا افسوس بھی ظاہر کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ آزادی سے پہلے یہ ہر مذہب و ملت میں یکساں مقبول تھی اور سب ہی اس کو پڑھتے تھے، آزادی میں اس کا شاندار رول تھا اور اس وقت یہ دفتری اور عدالتی زبان تھی، اعداد و شمار پیش کرکے آزادی کے بعد اردو کی یہ ترقی دکھائی ہے کہ اخبار اور رسالے زیادہ نکل رہے ہیں اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے لیکن یہ ترقی و ترویج اس لیے تشویش ناک ہے کہ اس تعداد میں ہندو بہت کم ہیں اور گو سیکڑوں غیر مسلم شاعر و ادیب اب بھی ہیں مگر وہ سب ساٹھ پینسٹھ برس کے ہیں اور نوجوان نسل میں یہ عنقا ہیں، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ زبان پر کسی کی مناپلی نہیں ہوتی اور ہر زبان میں بولنے والے صرف ایک فرقے اور مذہب کے لوگ نہیں ہوتے لیکن انہیں شکایت ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اردو کی تعلیم و ترویج کا کام مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے انجام دیا جارہا ہے کیوں کہ یہ سرگرمیاں مسلم علاقوں تک محدود ہیں، ہندو علاقے میں ان کا فقدان ہے، ان کے نزدیک یہ بھی افسوس ناک ہے کہ مسلمانوں کی زبان ہونے کی بنا پر اردو کے لیے مراعات طلب کی جاتی ہے اور سرکار یہی سمجھ کر سیاسی صورت حال اور مسلمانوں کی خوش نودی کی خاطر اسے مراعات دیتی ہے۔

جس صورت حال میں اور جو پالیسی اختیار کرکے اردو ترقی و ترویج کی منازل طے کررہی ہے اسے بھی مضمون نگار نے بہت تشویش ناک بتایا ہے کیوں کہ اس سے اردو اپنے سیکولر کردار سے محروم، اس کی گنگا جمنی خصوصیت ختم اور وہ مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جائے گی، اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے والے گو ہندو بھی ہیں مگر مسلمانوں کے موجودہ رویے نے دیگر فرقوں کو اس زبان سے دور اور بدظن کردیا ہے، یہاں تک کہ نئی نسل کی اکثریت اسے مسلمانوں کی زبان ہی سمجھتی ہے اور کچھ تو پاکستان کی بھی۔ اور اس کا ذمہ دار مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ ہے جو اس زبان کو قومی دھارے سے دور کرتا جارہا ہے، ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک اس لیے ہے کہ وہ پاکستان کی سرکاری زبان بن

گئی ہے اور ہندی نے ہندوستان میں قومی زبان کی مسند سنبھال لی، اس مضمون میں اگر کچھ صحیح ہے تو وہ ته به ته غلطیوں میں چھپ گیا ہے، عدم گنجایش کی بنا پر چند باتیں ہی عرض کی جاتی ہیں، اردو کی ترقی، ترویج کا ذکر تو بار بار کیا گیا ہے مگر اس کی تعلیم کا ذکر بہت کم ہے، حالانکہ اردو کا اصل مسئلہ اس کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم ہی کا ہے، جس کا رواج سرکاری اسکولوں میں آزادی کے بعد بالکل نہیں رہا، اس کے بغیر اخبار و رسالے پڑھنے اور پی ایچ ڈی کرنے والے کہاں سے آئیں گے، مقالہ نگار نے اس پر کوئی کرب ظاہر نہیں کیا کہ اتر پردیش میں ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں، مسلمان اگر مکاتب و مدارس میں اس کا انتظام کرتے ہیں تو وہ اردو سے ہندوؤں کو بدظن اور اردو کو قومی دھارے سے دور کردیتے ہیں۔ اردو کی ترقی و ترویج کے جس انداز و پالیسی پر اعتراض کیا گیا ہے اس کا مطلب ہم نے یہی سمجھا ہے کہ وہ مکاتب و مدارس میں کیوں پڑھی اور پڑھائی جارہی ہے، اس سے سیکولر کے بجائے مذہبی لٹریچر وجود میں آئے گا حالانکہ آزادی سے پہلے سے یہ ہورہا ہے اور خود ہندو دھرم اور اس کی مقدس کتابوں رامائن اور بھگوت گیتا پر اردو کا ذخیرہ کم نہیں ہے، آزادی کے بعد جب اردو کا دائرہ سمٹ کر مدرسوں تک محدود ہوگیا ہے تو ان کے بس میں جو ہے وہی تو اردو کے لیے کریں گے، اگر ہندوؤں کو ان کے مذہبی لٹریچر کی تالیف سے روکا جاتا تو یہ قابل اعتراض ہوتا، اردو مراکز کے ہندو علاقے میں قایم نہ کیے جانے کی بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن انجمن ترقی اردو نے جو صباحی و شبینہ مکاتب کھولے تھے اس کا تجربہ مسلم علاقوں میں بھی ناکام رہا، اعداد و شمار کی فہرست ایک فریب ہے، آزادی سے پہلے اور بعد کی آبادی کو ملحوظ رکھیے اور آزادی کے بعد ہندی میں پی ایچ ڈی کرنے اور اخبار و رسالوں کے اعداد و شمار بھی پیش کیجیے تب ہی صحیح صورت سامنے آئے گی، رہی اردو کی ترقی و مراعات تو بہ قول آپ کے یہ سیاسی، مسلمانوں کی خوش نودی کی خاطر اور ہمارے خیال میں نمایشی اور دکھاوا ہے عملاً تو اردو کشی ہورہی ہے، ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کم تر ہوجانے کا ملال مسلمانوں کو آپ سے کم نہیں ہے لیکن بڑھ کر ہاتھ میں مینا اٹھا لینے سے انہیں کس نے روکا ہے، اردو کے ساٹھ پینسٹھ برس کے غیر مسلم ادیبوں نے اردو سے فایدہ تو بہت اٹھایا لیکن اگر وہ اپنے بچے اور بچیوں کو اردو بھی پڑھاتے تو آج کمی کا گلہ نہ ہوتا، کیا یہ بھی ردعمل کا فلسفہ ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہونے کا خمیازہ بھارت کے اردو والے بھگتیں، نند کشور وکرم صاحب کو بہ تدریج اردو کے مسلمانوں کی زبان بن جانے کا تو اتنا غم ہے مگر اسے مغلوں، ترکوں اور دہشت گردوں کی زبان کہنے والوں کی مذمت کا کوئی لفظ ان کی زبان پر نہیں آیا، ممکن ہے اس میں بھی وہ مسلمانوں ہی کو موردِ الزام سمجھتے ہوں۔

مقالات

خواجہ نظام الدین اولیاء کا سنہ ولادت

از جناب فیروز الدین احمد فریدی☆

خواجہ نظام الدین اولیاء کے سنہ ولادت کے تعین کی کلید ان کے محب اور محبوب پیر و مرشد فرید الدین مسعود گنج شکر کے سال وصال کے تعین میں ہے، پچھلی کئی صدیوں کے دوران فرید الدین مسعود گنج شکر کا سال وصال ایک پُر اسرار نظر بندی کے حصار میں رہا، اکیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہ حصار ٹوٹ چکا ہے جو خواجہ نظام الدین اولیا کی رہنمائی اور فرید الدین مسعود کی سرپرستی کی وجہ سے ممکن ہوا، اب وہ وقت آگیا ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے فرمودات کی روشنی میں خواجہ صاحب کے سنہ ولادت کا بھی تعین کردیا جائے، واضح رہے کہ جس طرح فرید الدین مسعود گنج شکر کے سال وصال کے بارے میں مختلف سنین درج کیے جاتے رہے، اسی طرح خواجہ نظام الدین اولیاء کے سنہ ولادت کے بارے میں بھی مختلف حضرات نے جن میں بعض نامی گرامی محقق اور مؤرخ بھی شامل ہیں، مختلف سنین بیان کیے ہیں جن میں سے کوئی سنہ بھی درست نہیں ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنے سنہ ولادت کے تعین کے لیے بالکل واضح اور تقریباً مکمل رہنمائی خود کی ہے، جو "فوائد الفواد" اور "سیر الاولیاء" میں ان کے فرمودات میں درج ہے، متعلقہ اقتباسات نیچے درج کیے جاتے ہیں

(۱) فوائد الفواد: فوائد الفواد کے دو فقرے متعلقہ ہیں، پہلے فقرے کا فارسی متن اور اس متن کے اردو اور انگریزی ترجمے نیچے درج ہیں جن میں کوئی فرق نہیں، یہ تراجم اور ان کے بارے میں یہ وضاحت دینے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ بعض دیگر (کلیدی) مقامات پر مطبوعہ فارسی متن اور اس کے مطبوعہ اردو یا انگریزی تراجم میں فرق پایا گیا ہے یا ان میں کمی بیشی نوٹ کی گئی ہے۔

☆ کھتوال ہاؤس، ۵۴-اے-۱، اسٹریٹ نمبر ۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی۔

(الف): فوائد الفواد (مطبوعہ فارسی) ناشر شیخ سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور، سال اشاعت ۱۹۶۶ء، صفحہ نمبر ۲۰۷ پر، ۲۷ ذی قعدہ ۷۰۹ھ (مطابق ۲۸ اپریل ۱۳۱۰ء) کو، دوسری جلد کی دوسری مجلس میں یہ فقرہ درج ہے "بر لفظ مبارک داند کہ من سہ کرت بخدمت شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز رفتہ ام، ہر سال یک بار"۔

(ب): فوائد الفواد (اردو ترجمہ) مترجم خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی، صفحہ نمبر ۲۱۶، سال اشاعت نہیں دیا، "زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ میں تین دفعہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا، ہر سال ایک بار"۔

(ج): "MORALS FOR THE HEART" Translator Brucc B. Lawrence (Pages 128-129) "From his blessed lips, he recounted:" Three times, once each year, while he (BABA FARID) was alive, I had gone to visit Shaykh al - Islam Farid of Truth, of Law, of Faith (Farid ad - din) _ may God sanctify his lofty seeret."

فوائد الفواد کا دوسرا فقرہ خواجہ صاحب کی پاک پتن سے آخری بار دہلی کے لیے روانگی کے بارے میں ہے جو شوال ۶۶۹ھ میں ہوئی، یہ فقرہ جمادی الاولی، شعبان اور رمضان (۶۶۹ھ) میں پاک پتن میں ہونے والے واقعات کا تسلسل اور اختتامیہ ہے، چوں کہ یہ واقعات فوائد الفواد میں درج نہیں بلکہ سیر الاولیاء میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے فوائد الفواد کے اس دوسرے فقرے کو سیاق و سباق میں سمجھنے کے لیے سیر الاولیاء کے متعلقہ اقتباسات درج کرنے کے بعد سب سے آخر میں لکھا گیا ہے اور یہاں درج نہیں کیا جا رہا ہے۔

(II) سیر الاولیاء: سیر الاولیاء کے سات متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں:-

نمبر شمار	اردو ترجمہ	چرنجی لال (لاہور-۱۹۷۸ء)	کراچی میوزیم کا قلمی نسخہ (سال کتابت نامعلوم)	برٹش لائبریری لندن کا قلمی نسخہ (۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء)
		(صفحہ نمبر ۳۹۷) ۔	(مفروضہ صفحہ نمبر ۳۴۴)	
۱-	فرماتے تھے کہ ماہ صفر کا	ے فرمود کہ روز چہار شنبہ	میفرمود کہ روز چہار شنبہ	

نمبر شمار	اردو ترجمہ	چرنجی لال (لاہور-۱۹۷۸ء)	کراچی میوزیم کا قلمی نسخہ (سال کتابت نامعلوم)	برٹش لائبریری لندن کا قلمی نسخہ (۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء)
	آخری بدھ بہت بابرکت ہوتا ہے ...... اور فرماتے تھے کہ یہ ضعیف بھی اسی روز پیدا ہوا تھا۔	آخریں ماہ صفر قوی بابرکت است...... و مےفرمود کہ تولد ایں ضعیف ہمدریں روز است (صفحہ نمبر ۱۱۷)	ماہ صفر قوی بابرکت است ...... و میفرمودند کہ تولد ایں ضعیف ہمدریں روز است (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۲۹)	
۲-	سلطان المشائخ سے پوچھا گیا کہ جب آپ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین طیب اللہ مرقدہ کے مرید ہوئے تو کتنے سال کے تھے، فرمایا بیس سال کا۔	از سلطان المشائخ پرسیدند کہ شما چند سالہ بودید کہ بدولت ارادت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین طیب اللہ مرقدہ مشرف شدید، فرمود کہ بیست سالہ (صفحہ نمبر ۱۳۶)	از سلطان المشائخ پرسیدند کہ شما چند سالہ بودید کہ بدولت ارادت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین طیب اللہ مرقدہ مشرف شدید، فرمود کہ بیست سالہ (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۶۱)	(ورق نمبر ۵۸ کی پشت رصفحہ ۱۱۵)
۳-	میں دہلی سے تین بار شیخ شیوخ العالم کے پاس گیا۔	سہ کرت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ العالم رفتم (صفحہ نمبر ۱۳۳)	سہ کرت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ العالم رفتم (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۴۶)	سہ کرت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ العالم رفتم (ورق نمبر ۶۰ کی پشت رصفحہ ۱۱۹)
۴-	سلطان المشائخ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز نے کاتب حروف کو بلایا جمعہ کے دن نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد ۲۵ر جمادی الاولی ۶۶۹ھ	سلطان المشائخ بقلم مبارک خود نبشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کہ کاتب حروف را بخواند در روز آدینہ بعد از فراغ نماز بیست و پنجم ماہ جمادی الاول سنہ	سلطان المشائخ بقلم مبارک نبشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کاتب را بخواند در روز آدینہ بعد از فراغ نماز بیست پنجم ماہ جمادی الاول سنہ تسع وستین وستمایہ لعاب	سلطان المشائخ بقلم مبارک نبشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کاتب حروف را بخواند در روز آدینہ بعد از نماز بیست و پنجم ماہ جمادی الاول سنہ تسع وستین

نمبر شمار	اردو ترجمہ	چرنجی لال (لاہور-۱۹۷۸ء)	کراچی میوزیم کا قلمی نسخہ (سال کتابت نامعلوم)	برٹش لائبریری لندن کا قلمی نسخہ (۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء)
	(۱۲۷۰ء) کو اپنے منہ کا لعاب کاتب حروف کے منہ میں ڈالا۔	تسع وستین وستمائہ لعاب از دہن مبارک در دہن کاتب کرد (صفحہ نمبر ۱۳۳)	از دہن مبارک در دہن کاتب کرد (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۴۶)	وستمائہ لعاب از دہن مبارک خود در دہن کاتب حروف کرد (ورق نمبر ۶۰ کی پشت/صفحہ ۱۱۹)
۵-	یکم شعبان ۶۶۹ھ (۱۲۷۱ء) کو میں نے شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز سے التماس کی، اس کے لیے شیخ شیوخ العالم نے فاتحہ پڑھ کر قبولیت کی دعا مانگی وہ التماس یہ تھی کہ "میں در بدر نہ ہوں"۔	در غرہ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستمائہ از حضرت شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز التماس نمودہ آمد شیخ شیوخ العالم با اجابت و مدد فاتحہ مقرون فرمود از برائے آں کہ کاتب در بدر خلق نہ گردد (صفحہ نمبر ۱۲۶)	در غرہ ماہ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستمائہ از حضرت شیخ شیوخ العالم با اجابت و مدد فاتحہ مقرون فرمود از برای آن کہ کاتب در بدر خلق نہ شد. مفروضہ صفحات نمبر ۱۶۱-۱۶۲)	در غرہ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستمائہ از حضرت شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز التماس نمودہ آمد شیخ شیوخ العالم با اجابت فاتحہ و مدد مقرون فرمود از برائے آنکہ کاتب در بدر نہ شود ورق نمبر ۵۸ کی پشت/صفحہ ۱۱۵
۶-	ایک دن آپ نے مجھے طلب کیا، یہ رمضان کی تیرہ تاریخ اور سنہ ۶۶۹ھ (۱۲۷۱ء) تھا فرمایا کہ کاغذ لاؤ تاکہ خلافت نامہ لکھا جائے کاغذ لایا گیا، آپ نے خلافت نامہ لکھا۔	یک روز خواجہ طلبید سیزدہم ماہ رمضان سنہ تسع وستین وستمائہ بود...... وفرمود کہ کاغذ بیارید اجازت نامہ بنویسند کاغذ آوردند، اجازت نامہ بخشد (صفحہ نمبر ۹۹)	ایک روز خواجہ طلبید سیزدہم ماہ رمضان سنہ تسع وستین و بود وفرمود کہ کاغذ بیارید اجازت نامہ بنویسند کاغذ آوردند، اجازت نامہ بخشد (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۱۰)	یک روز خواجہ طلبید سیزدہم ماہ رمضان سنہ تسع وستین وستمائہ بود...... وفرمود کہ کاغذ بیارید اجازت نامہ بنویسند کاغذ آوردند، اجازت نامہ نوشتند (ورق نمبر ۴۶/صفحہ ۹۰)
۷-	سلطان المشائخ سے پوچھا گیا	از سلطان المشائخ سوال	از سلطان المشائخ سوال	از سلطان المشائخ سوال

نمبر شمار	اردو ترجمہ	چرنجی لال (لاہور-۱۹۷۸ء)	کراچی میوزیم کا قلمی نسخہ (سال کتابت نامعلوم)	برٹش لائبریری لندن کا قلمی نسخہ (۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء)
	کہ کیا آپ (باباصاحب) کے انتقال کے وقت موجود تھے، آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور فرمایا کہ نہیں مجھے (بابا صاحب) نے ماہ شوال میں دہلی کے لیے روانہ کردیا تھا۔	کروند کہ شما در وقت نقل حاضر بودید چشم پُر آب کرد وفرمود کہ خیر در ماہ شوال مرا بدہلی رواں کرد	کروند کہ شما در وقت نقل حاضر بودند چشم پُر آب کرد وفرمود کہ خیر در ماہ شوال مرا بدہلی رواں کرد	کروند کہ شما در وقت نقل حاضر بودید چشم پُر آب کرد وفرمود کہ خیر در ماہ شوال مرا بدہلی روان کرد

ماہ شوال میں دہلی کے لیے روانگی کے بارے میں فوائد الفواد میں بھی ذکر ہے، فوائد الفواد کی دوسری جلد کی آٹھویں مجلس میں جو ۲۷/ربیع الاول ۷۱۰ھ (۲۴/اگست ۱۳۱۰ء) بہ روز پیر منعقد ہوئی، خواجہ صاحب سے فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن ملا سنجری نے پوچھا کہ:

"کیا آپ شیخ کے انتقال کے وقت موجود تھے؟ حضرت آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ارشاد کیا کہ نہیں مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا تھا"۔ (صفحہ نمبر ۲۳۲، خواجہ حسن ثانی نظامی کے اردو ترجمے سے)

مندرجہ بالا ملفوظات میں گو ماہ شوال کے سنہ کا ذکر نہیں لیکن سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ بات سنہ ۶۶۹ھ (۱۲۷۱ء) کے ماہ شوال کے بارے میں کی جارہی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں فوائد الفواد کے دو اور سیر الاولیا کے سات اقتباسات کی روشنی میں خواجہ صاحب کے سنہ ولادت کے حوالے سے مندرجہ ذیل نکات ابھرتے ہیں:-

۱- جب آپ باباصاحب کے مرید ہوئے اور یہ بے بہا اور لازوال دولت، پہلی حاضری میں ہی مل گئی تھی تو آپ کی عمر ۲۰ سال تھی۔

۲- آپ باباصاحب کی حیات میں تین بار ان کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ ہر برس ایک بار حاضری ہوتی رہی۔

۳- سنہ ۶۶۹ھ کی حاضری باباصاحب کی حیات میں، خواجہ صاحب کی پاک پتن میں

تیسری (اور آخری) حاضری تھی۔

تیسری حاضری کا تعین تو ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ دوسری حاضری کس سنہ میں ہوئی؟ اور پہلی حاضری کس سنہ میں ہوئی؟ آیا یہ حاضریاں تین متواتر برسوں میں لگاتار ہوئیں؟ یا اس طرح ہوئیں کہ پہلی اور دوسری حاضری میں برسوں کا وقفہ ہوا یا یہ کہ دوسری اور تیسری حاضری میں برسوں کا وقفہ ہوا؟ یا اور یہ کہ پہلی اور دوسری حاضری میں بھی برسوں کا وقفہ ہوا اور ایسا ہی وقفہ دوسری اور تیسری حاضری میں بھی ہوا؟۔

اس سوال کا جواب کتابوں میں تو نہیں ملتا لیکن عقل سلیم سے یہ ملتا ہے کہ باباصاحب کو دیکھے بغیر صرف ان کا نام سن کر خواجہ صاحب کو لڑکپن سے باباصاحب سے جو والہانہ محبت ہو گئی تھی اور ۲۰ سالہ نوجوان خواجہ نظام الدین اولیا کی ۸۷ سالہ فرید الدین مسعود گنج شکر سے پہلی ملاقات کے وقت باباصاحب عمر کے جس حصے میں تھے، اس کے پیش نظر خواجہ صاحب نے اپنی پہلی حاضری کے بعد اپنی بقیہ دو حاضریوں میں سال بھر کا وقفہ نہیں آنے دیا ہوگا، آتش فراق صرف ایک طرف تو نہیں سلگ رہی تھی، سیلاب اشتیاق صرف ایک طرف تو نہیں بہہ رہا تھا، دونوں ایک دوسرے کے محب اور محبوب تھے، اگر یہ درست ہے جو کہ درست ہے تو پاک پتن میں خواجہ صاحب کی پہلی حاضری ۶۶۷ھ، دوسری ۶۶۸ھ اور باباصاحب کی حیات میں تیسری اور آخری حاضری، جس کی سند موجود ہے ۶۶۹ھ میں ہوئی، یہ سند سیر الاولیا کے وہ اقتباسات ہیں جو بالائی سطور میں دی گئی جدول میں نمبر شمار ۴، ۵، ۶ اور ۷ پر دیے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کے پہلے سفر (۶۶۷ھ) کے بارے میں یہ علم نہیں کہ وہ کس ماہ یا موسم میں شروع ہوا، عشق کے سفر میں موسم کی ڈائری نہیں لکھی جاتی، ایک روز فجر کے وقت دلی کی ایک مسجد کے مینار سے اللہ کا کلام عشق کا پیغام بن کر گونجا اور خواجہ صاحب ایک اضطراری کیفیت میں بے سروسامانی کے عالم میں دلی سے پاک پتن کے لیے روانہ ہو گئے اور افتاں و خیزاں منزلیں مارتے ہوئے (بدھ کے دن) پاک پتن پہنچ گئے۔

خواجہ صاحب کے دوسرے سفر (۶۶۸ھ) کے بارے میں بھی اسی طرح علم نہیں کہ وہ کس ماہ یا موسم میں شروع ہوا تاہم اگر دوسرے سفر (۶۶۸ھ) کی روانگی، پہلے سفر (۶۶۷ھ) کی طرح اضطراری کیفیت میں نہیں ہوئی تو یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ بہتر موسم میں ہوئی ہوگی، یہ

قیاس گو محض قیاس ہے لیکن سراسر بے بنیاد نہیں، تیسرے اور آخری سفر (۶۶۹ھ) کے بارے میں شواہد یہ نشان دہی کر رہے ہیں کہ یہ موسم سرما (اکتوبر یا نومبر ۱۲۷۰ء) میں شروع کیا گیا، یہ شواہد جدول نمبر 1 سے واضح ہو جائیں گے جس میں خواجہ صاحب کے ان تین سفروں کے بارے میں بعض اہم تاریخیں اور نکات دیے گئے ہیں۔

جہاں تک سفر کے دوران آنے کا تعلق ہے تو ابن بطوطہ کے مطابق دلی سے ملتان کا سفر چالیس دن میں طے ہوتا تھا، پاک پتن اور دلی دونوں ملتان کے شمال مشرق میں واقع ہیں، ملتان سے پاک پتن ۱۵۰ میل (۲۲۵ کلومیٹر) شمال مشرق میں ہے، اس طرح ملتان کی نسبت پاک پتن دلی سے تقریباً اتنا ہی قریب تر ہوا اور دلی سے پاک پتن کا سفر چالیس دن سے کم (مثلاً ایک مہینے میں) کے عرصے میں طے ہو جانا چاہیے، تاہم ابن بطوطہ جیسے تجربہ کار اور باوسیلہ جہاں گرد کو سفر کے لیے جو سہولیات اور سواریاں میسر ہوں گی، وہ بھلا تنگ دست اور نوجوان خواجہ نظام الدین کے پاس کہاں ہوں گی؟ اس وجہ سے یہ قیاس بے بنیاد نہیں کہ خواجہ صاحب کو دلی سے پاک پتن پہنچنے میں چالیس، پینتالیس روز لگ جاتے ہوں گے اور یہ اس کے باوجود ہوتا ہوگا کہ باباصاحب کے دیدار کے اشتیاق میں خواجہ صاحب دلی سے پاک پتن جاتے ہوئے راستے میں پڑاؤ کا وقفہ کم سے کم رکھتے ہوں گے اور اپنے دوستوں اور پیر بھائیوں سے تفصیلی ملاقات پاک پتن سے واپسی کے لیے موخر کرتے ہوں گے، فوائد الفواد میں اپنے پیر بھائی جمال الدین ہانسوی سے سردیوں میں ملاقات کا ذکر ہے، یہ ذکر فوائد الفواد کی دوسری جلد کی نویں مجلس میں ملتا ہے جو ۱۰ ربیع الثانی ۷۱۰ھ (مطابق ۶ ستمبر ۱۳۱۰ء) بروز ہفتہ منعقد ہوئی، خواجہ حسن ثانی نظامی کے اردو ترجمے کے صفحہ نمبر ۲۳۵ پر اس ملاقات کا ذکر ان دل چسپ الفاظ میں ہے:۔

"میں (خواجہ صاحب) ایک دفعہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے پاس گیا، اشراق کا وقت تھا اور سردی کا موسم، شیخ جمال الدین نے مجھے مخاطب کر کے یہ دو مصرعے پڑھے ~

باروغن گاؤ اندریں روز خنک   نیکو باشد ہریسہ و نان تنک

(ترجمہ: آج کے سرد دن گھی، ہریسہ اور پراٹھے ہوتے تو کیا خوب ہوتا۔

''میں (خواجہ صاحب) نے کہا کہ ''ذکر الغائب غیبۃ'' یعنی غائب (آدمی یا شے) کا ذکر کرنا غیبت ہے، شیخ جمال الدین بولے کہ میں نے اس (غائب) کو حاضر کرلیا ہے، تب ہی کہا ہے، ان کے کہنے کی دیر تھی کہ یہ چیزیں لائی گئیں''۔

ہانسی کا شہر دلی اور پاک پتن کے درمیان آتا ہے اور اغلباً یہ ملاقات دلی سے پاک پتن جاتے ہوئے کسی سفر کے دوران ہوئی۔

جہاں تک پاک پتن میں قیام کے دوران آنے کا تعلق ہے تو پہلی اور دوسری حاضری کے بارے میں علم نہیں کہ قیام کتنا رہا تاہم تیسری حاضری میں قیام کے سوا چار مہینے ہونے کے بارے میں کوئی شبہہ نہیں، کیوں کہ خواجہ صاحب کم از کم ۲۵ / جمادی الاولیٰ (۶۶۹ھ) سے کم از کم یکم شوال (۶۶۹ھ) تک پاک پتن میں تھے، امکان یہی ہے کہ وہ ۲۵ / جمادی الاولیٰ سے پہلے بابا صاحب کا دیدار کرنے پاک پتن پہنچے ہوں گے اور عید الفطر کے پہلے بندرھواڑ سے پاک پتن سے دلی کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے، اس طرح قیام کی مدت سوا چار ماہ سے یقیناً زیادہ ہوگی، پہلی حاضری اور دوسری حاضری میں پاک پتن میں قیام کے دوران آنے کے بارے میں ایک عام سمجھ بوجھ کا آدمی یہی کہے گا کہ جب آج سے سات صدی پہلے، ایک شخص سوا ماہ یا ڈیڑھ ماہ کے سفر کی سختیاں اور تھکن برداشت کر کے دلی سے پاک پتن آئے گا اور پھر ڈیڑھ دو ماہ کے واپسی کے سفر کی سختیاں، تھکن اور اغلباً سخت گرمی برداشت کرتا ہوا پاک پتن سے دلی لوٹے گا تو وہ پاک پتن میں مہینوں ضرور ٹھہرے گا، خصوصاً جب یہ سفر عشق کا سفر ہو، ۶۶۷ھ، ۶۶۸ھ اور ۶۶۹ھ میں موسم گرما اور موسم سرما کے مہینوں کا اندازہ لگانے کے لیے ان تین ہجری سنین سے مطابقت رکھنے والے عیسوی کیلنڈر کے مہینے جدول نمبر 2 میں دیے گئے ہیں جدول نمبر 1 اور 2 کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا صاحب کی حیات میں، خواجہ صاحب اپنے آخری قیام پاک پتن کے دوران ۲۵ / جمادی الاولیٰ ۶۶۹ھ (۹ / جنوری ۱۲۷۱ء) کو پاک پتن میں تھے، اس بنا پر یہ ایک محتاط قیاس ہوگا کہ خواجہ صاحب نے دلی سے پاک پتن کے لیے اپنے سفر کا آغاز سردیوں کے موسم میں کیا ہوگا، پاک پتن سے دہلی کے واپسی کے سفر کے بارے میں جدولیں نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ سفر وسط مئی سے مئی کی آخری تاریخوں کے درمیان سخت گرمیوں میں شروع کیا گیا ہوگا اور اس کا

امکان ہے کہ جون اور جولائی (۱۲۷۱ء) کے پورے مہینے اور شاید اگست (۱۲۷۱ء) کا ابتدائی نصف حصہ واپسی کے سفر میں گزر گئے ہوں۔

اگر ۲۰ سالہ خواجہ نظام الدین کی پاک پتن میں پہلی حاضری ۶۶۷ھ میں ہوئی تو اس حساب سے ان کا سنہ ولادت ۶۴۷ھ ہوا، جہاں تک خواجہ صاحب کی پیدائش کے دن اور مہینے کا تعلق ہے، اس میں کبھی کسی کو اختلاف نہیں ہوا، ہم نے پچھلے صفحات میں سیر الاولیا سے جو سات اقتباسات دیے تھے ان میں پہلا اقتباس خواجہ صاحب کی ولادت کے دن (بدھ) اور ولادت کے مہینے (ماہ صفر) کے بارے میں ہے، یہ ایک واضح بیان ہے، اس کے علاوہ فوائد الفواد کی چوتھی جلد کی چوتھی مجلس میں جو ۲۷ / صفر ۷۱۴ھ (۱۲ / جون ۱۳۱۴ء) بہ روز بدھ منعقد ہوئی، اس ضمن میں یہ تحریر ہے:-

''اسی سال (۷۱۴ھ) ماہ صفر کی ستائیسویں تاریخ بدھ کو قدم بوسی کی دولت حاصل ہوئی، اس سے ایک روز پہلے بندے (فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن علا سنجری) نے محترم نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) سلمہ اللہ تعالیٰ سے جو خوش اعتقاد مریدوں میں سے ہیں، مشورہ کیا تھا کہ کل آخری بدھ ہے اور لوگ اس روز کو منحوس سمجھتے ہیں، آیئے (اپنے) خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کی خدمت میں چلیں کیوں کہ وہاں ساری نحوستیں سعادت سے بدل جاتی ہیں، غرضیکہ مشورے کے مطابق جب یہ بدھ آیا تو بندہ اور وہ، دونوں کے دونوں، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کی خدمت میں پہنچے اور لوگوں کے اس وہم کے بارے میں عرض کیا، حضرت نے تبسم فرمایا اور بولے کہ ہاں لوگ اس دن کو منحوس سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ دن تو بڑا اچھا دن ہے، آج کا دن بہت ہی مبارک ہے، چنانچہ اگر اس دن فرزند پیدا ہوتا ہے تو وہ بزرگ بنتا ہے''۔ (صفحات ۳۳۸ تا ۳۳۹، فوائد الفواد کا اردو ترجمہ از خواجہ حسن نظامی ثانی دہلوی)

فوائد الفواد کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ امیر حسن علا سنجری اور نصیر الدین محمود چراغ دہلی یہ جانتے بوجھتے کہ ماہ صفر کے آخری بدھ کا دن خواجہ نظام الدین اولیا کا یوم ولادت ہے، ان کے پاس پہلے سے مشورہ کر کے یہ پوچھنے پہنچے کہ لوگ اس دن کو منحوس کیوں سمجھتے ہیں اور یہ تاثر تو قطعاً نہیں ملتا کہ ان دونوں بزرگوں کو نہ صرف پہلے سے یہ معلوم تھا کہ ماہ صفر کا آخری بدھ خواجہ صاحب کا ''یوم'' ولادت ہے بلکہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ خواجہ صاحب کی ''تاریخ'' ولادت

۲۷ رصفر ہے اور اسی وجہ سے ان دونوں حضرات نے بدھ ۲۷ رصفر (۱۴ ۷ ھ) کو خواجہ نظام الدین اولیا سے یہ سوال کرنے کے لیے اس دن اور اس تاریخ کو منتخب کیا، فوائد الفواد کے مندرجہ بالا ملفوظات سے یہ تاثر بہرحال ابھرتا ہے کہ خواجہ صاحب نے انتہائی لطیف پیرائے میں یہ اشارہ کیا ہے کہ یہ دن (یعنی ماہ صفر کا آخری بدھ) بہت ہی مبارک دن ہے اور یہ ان کا یوم ولادت ہے، اشارہ دن (بدھ) کی طرف ہے تاریخ ۲۷ رصفر) کی طرف نہیں۔

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیا کا سنہ ولادت ۶۴۷ ھ (مطابق ۱۲۴۹ء) ہے، آپ اس سال ماہ صفر کے آخری بدھ کو پیدا ہوئے، تقویم کے مطابق ۶۴۷ ھ میں ماہ صفر کے آخری بدھ کو صفر کی ۲۵ تاریخ تھی، ۲۵ رصفر ۶۴۷ ھ کو اسی تقویم کے مطابق ۹ رجون ۱۲۴۹ء تھا، تقویم کے مطابق صدیوں قبل کی جو قمری یا عیسوی تاریخیں نکالی جاتی ہیں وہ قطعی نہیں ہوتیں، ان میں ایک آدھ تاریخ آگے پیچھے ہوسکتی ہے، خواجہ صاحب کی ولادت کے بارے میں تاریخی شہادت اور ریکارڈ کی بناپر صرف تین امور ثابت ہوتے ہیں، اولاً آپ کی ولادت بدھ کے دن ہوئی، ثانیاً آپ کی ولادت ماہ صفر کے آخری بدھ کے دن ہوئی، ثالثاً آپ کی ولادت ۶۴۷ ھ کے ماہ صفر کے آخری بدھ کے روز ہوئی گو تقویم کے مطابق یہ تاریخ ۲۵ رصفر نکلتی ہے لیکن یہ ۲۶ رصفر بھی ہوسکتی ہے اور ۲۴ رصفر بھی ہوسکتی ہے تاہم سنہ ۶۴۷ ھ رہے گا اور دن بدھ رہے گا، اسی طرح قمری تقویم کو عیسوی تقویم میں تبدیل کرنے پر یہ تاریخ ۹ رجون نکلتی ہے لیکن یہ ۱۰ رجون بھی ہوسکتی ہے اور ۸ رجون بھی تاہم عیسوی سنہ ۱۲۴۹ء رہے گا اور دن بدھ۔

خواجہ نظام الدین اولیا کی ولادت اور وفات دونوں بدھ کے روز ہوئیں اور بابا صاحب کی خدمت میں پہلی بار حاضری بھی ۶۶۷ ھ میں بدھ کے روز ہوئی، ولادت، وصل اور وصال کے لیے قسام ازل کی طرف سے بدھ کا دن منتخب کیا گیا تھا۔

سطور بالا کی روشنی میں خواجہ نظام الدین اولیا کی ولادت اور وفات کی تاریخیں یہ بنتی ہیں:۔

	ولادت	وفات	عمر
(۱) دن	بدھ	بدھ	قمری تقویم سے ۷۸ برس۔
(۲) وقت	نہیں معلوم گو بعض روایات میں "طلوع آفتاب" بیان کیا گیا ہے۔	تقریباً سات بجے صبح	عیسوی تقویم سے تقریباً ۷۶ برس۔
(۳) تاریخ	اغلباً ۲۵ رصفر مطابق ۹ رجون	۱۸ ربیع الثانی، اغلباً ۳ راپریل	
(۴) سنہ	۶۴۷ ھ مطابق ۱۲۴۹ء	۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء	

جدول نمبر 1

بابا صاحب کی حیات میں خواجہ صاحب کی پاک پتن میں حاضریوں کے بارے میں اہم تاریخیں اور کوائف۔

کوائف	قمری اور عیسوی تاریخیں	قمری اور عیسوی تاریخیں	قمری اور عیسوی تاریخیں
	(۱)	(۲)	(۳)
	۶۶۷ ھ (۱۰ رستمبر ۱۲۶۸- ۳۰ راگست ۱۲۶۹ء	۶۶۸ ھ (۳۱ راگست ۱۲۶۹ -۱۹ راگست ۱۲۷۰)	۶۶۹ ھ (۲۰ راگست ۱۲۷۰- ۸ راگست ۱۲۷۱)
۱-دلی سے پاک پتن کی روانگی کا مہینا۔	نہیں معلوم، فیصلہ فجر کے وقت اچانک ہوا۔	نہیں معلوم تاہم اگر روانگی موسم سرما میں ہوئی تو وہ ماہ صفر/اکتوبر میں یا اس کے بعد ہوگی۔	ربیع الاول یا ربیع الثانی کے آغاز میں امکان ہے یعنی اکتوبر یا نومبر کے مہینوں میں۔
۲-دلی سے پاک پتن کے سفر کا دورانیہ۔	اغلباً ڈیڑھ ماہ، یہ کون سے مہینے تھے اس کا تعین نہیں ہوسکتا، سفر بہ ممکن تیز رفتاری سے کیا گیا ہوگا یہ پہلی حاضری تھی۔	اغلباً ڈیڑھ ماہ، کیلینڈر کے مہینوں کا تعین نہیں ہوسکتا، ملاقات کے اشتیاق میں سفر خاصی تیز رفتاری سے کیا گیا ہوگا۔	اغلباً ڈیڑھ ماہ جو ربیع الاول کے آغاز سے جمادی الاولی ۶۶۹ ھ کے درمیان کی کوئی تاریخیں ہوسکتی ہیں یعنی وسط اکتوبر سے آخر دسمبر۔
۳-پاک پتن میں آمد	نہیں معلوم	نہیں معلوم تاہم اگر روانگی اکتوبر ۱۲۶۹ء میں ہوئی تو پاک پتن میں آمد نومبر ۱۲۶۹ء مطابق ربیع الاول ۶۶۸ ھ	۲۵ رجمادی الاولی مطابق ۹ رجنوری ۱۲۷۱ کو خواجہ صاحب پاک پتن میں موجود تھے، اس لیے آمد غالباً دسمبر ۱۲۷۰ میں ہوئی

کوائف	قمری اور عیسوی تاریخیں	قمری اور عیسوی تاریخیں	قمری اور عیسوی تاریخیں
		ہوگی۔	یعنی ربیع الثانی ۶۶۹ کے آخری پندرھواڑے یا جمادی الاولی کے پہلے پندرھواڑے میں۔
۴۔ پاک پٹن میں قیام کا عرصہ	نہیں معلوم، اغلباً کئی مہینے رہا ہوگا کیوں کہ یہ ایک طویل انتظار کے بعد پہلی حاضری تھی، مہینوں کی تعداد کا تعین ممکن نہیں۔	امکانی طور پر مہینوں رہا ہوگا، کتنے مہینے؟ یہ نہیں کہا جا سکتا۔	پانچ ماہ یعنی جمادی الاولی کے پہلے پندرھواڑے سے شوال ۶۶۹ھ کے پہلے پندرھواڑے تک بہ صورت دیگر ساڑھے پانچ یا چھ ماہ یعنی ربیع الثانی کے آخری پندرھواڑے سے شوال ۶۶۹ھ کے پہلے پندرھواڑے تک اس دوران ۲۵ر جمادی الاولی، یکم شعبان اور ۱۳ر رمضان ۶۶۹ھ کے واقعات ہوئے، آخری واقعہ ۲۵ر اپریل ۱۲۷۱ء کو ہوا۔
۵۔ پاک پٹن سے دلی کی روانگی کا مہینا	نہیں معلوم	نہیں معلوم	شوال ۶۶۹ھ (مطابق وسط مئی ۱۲۷۱ء سے ۱۰ر جون ۱۲۷۱ء تک) کسی دن
۶۔ پاک پٹن سے دلی کے سفر کا دورانیہ۔	دو سے ڈھائی ماہ، راستے میں احباب سے تفصیلی ملاقات ہوئی ہوگی۔	دو سے ڈھائی ماہ	دو سے ڈھائی ماہ شوال کا آخری پندرھواڑا، ذی قعدہ اور ذی الحجہ ۶۶۹ھ (مطابق جون و جولائی اور اگست ۱۲۷۱ء) کا کچھ حصہ سفر میں گزرے ہوں گے

کوائف	قمری اور عیسوی تاریخیں	قمری اور عیسوی تاریخیں	قمری اور عیسوی تاریخیں
			جو پنجاب میں لو، شدید گرمی اور حبس کا موسم ہوتا ہے، بابا صاحب کا انتقال ۵ر محرم ۶۷۰ھ (مطابق ۱۳ یا ۱۴ر اگست ۱۲۷۱ء) کو پاک پٹن میں ہوا، خواجہ صاحب انہی تاریخوں میں واپس دلی پہنچے ہوں گے۔

جدول نمبر 2

۶۶۷ھ، ۶۶۸ھ اور ۶۶۹ھ کے مہینوں سے مطابقت رکھنے والے عیسوی سنین۔

قمری مہینا	۶۶۷ھ (۱۰ر ستمبر ۱۲۶۸- ۳۰ر اگست ۱۲۶۹۔	۶۶۸ھ (۳۱ر اگست ۱۲۶۹- ۱۹ر اگست ۱۲۷۰۔	۶۶۹ھ (۲۰ر اگست ۱۲۷۰- ۸ر اگست ۱۲۷۱۔
۱۔محرم	۱۲۶۸/۹/۱۰ تا ۱۲۶۸/۱۰/۹	۱۲۶۹/۸/۳۱ تا ۱۲۶۹/۹/۲۹	۱۲۷۰/۸/۲۰ تا ۱۲۷۰/۹/۱۸
۲۔صفر	۱۲۶۸/۱۰/۱۰ تا ۱۲۶۸/۱۱/۷	۱۲۶۹/۹/۳۰ تا ۱۲۶۹/۱۰/۲۸	۱۲۷۰/۹/۱۹ تا ۱۲۷۰/۱۰/۱۷
۳۔ربیع الاول	۱۲۶۸/۱۱/۸ تا ۱۲۶۸/۱۲/۷	۱۲۶۹/۱۰/۲۹ تا ۱۲۶۹/۱۱/۲۷	۱۲۷۰/۱۰/۱۸ تا ۱۲۷۰/۱۰/۱۶
۴۔ربیع الثانی	۱۲۶۸/۱۲/۸ تا ۱۲۶۹/۱/۵	۱۲۶۹/۱۱/۲۸ تا ۱۲۶۹/۱۲/۲۶	۱۲۷۰/۱۱/۱۷ تا ۱۲۷۰/۱۲/۱۵
۵۔جمادی الاولی	۱۲۶۹/۱/۶ تا ۱۲۶۹/۲/۴	۱۲۶۹/۱۲/۲۷ تا ۱۲۷۰/۱/۲۵	۱۲۷۰/۱۲/۱۶ تا ۱۲۷۱/۱/۱۴
۶۔جمادی الثانی	۱۲۶۹/۲/۵ تا ۱۲۶۹/۳/۵	۱۲۷۰/۱/۲۶ تا ۱۲۷۰/۲/۲۳	۱۲۷۱/۱/۱۵ تا ۱۲۷۱/۲/۱۲
۷۔رجب	۱۲۶۹/۳/۶ تا ۱۲۶۹/۴/۴	۱۲۷۰/۲/۲۴ تا ۱۲۷۰/۳/۲۵	۱۲۷۱/۲/۱۳ تا ۱۲۷۱/۳/۱۴
۸۔شعبان	۱۲۶۹/۴/۵ تا ۱۲۶۹/۵/۳	۱۲۷۰/۳/۲۶ تا ۱۲۷۰/۴/۲۳	۱۲۷۱/۳/۱۵ تا ۱۲۷۱/۴/۱۲
۹۔رمضان	۱۲۶۹/۵/۴ تا ۱۲۶۹/۶/۲	۱۲۷۰/۴/۲۴ تا ۱۲۷۰/۵/۲۳	۱۲۷۱/۴/۱۳ تا ۱۲۷۱/۵/۱۲
۱۰۔شوال	۱۲۶۹/۶/۳ تا ۱۲۶۹/۷/۱	۱۲۷۰/۵/۲۴ تا ۱۲۷۰/۶/۲۱	۱۲۷۱/۵/۱۳ تا ۱۲۷۱/۶/۱۰
۱۱۔ذی قعدہ	۱۲۶۹/۷/۲ تا ۱۲۶۹/۷/۳۱	۱۲۷۰/۶/۲۲ تا ۱۲۷۰/۷/۲۱	۱۲۷۱/۶/۱۱ تا ۱۲۷۱/۷/۱۰
۱۲۔ذی الحجہ	۱۲۶۹/۸/۱ تا ۱۲۶۹/۸/۳۰	۱۲۷۰/۷/۲۲ تا ۱۲ـ۰/۸/۱۹	۱۲۷۱/۷/۱۲ تا ۱۲ـ۱/۸/۸

بیسویں صدی میں عربی کی مغربی شاعری

از ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی ☆

(۳)

بیسویں صدی کی ابتدا میں الجزائر میں عربی ثقافت اور عربی زبان اور علوم وفنون کی طرح عربی شاعری بھی انحطاط کا شکار ہوگئی، شعرا فصیح عربی زبان کے بجائے مقامی زبان استعمال کرنے لگے، مقامی زبان کے رواج پانے سے لازماً شاعری کا معیار بھی متاثر ہوا۔

فرانسیسی استعمار نے دینی، علمی، ثقافتی، ادبی اور معاشی اعتبار سے الجزائر کے باشندوں کو کمزور اور عربی زبان، عربی تہذیب وثقافت اور دین اسلام سے دور کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، عیسائی مشنریوں نے گاؤں گاؤں میں مدارس کے جال بچھا کر فرانسیسی زبان اور عیسائیت کو فروغ دیا، پادری ''فوکو'' نے عیسائیت کو منصوبہ بند انداز میں پھیلایا اور پادری ''فجری'' نے یہاں تک کہا کہ وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ ''اہل الجزائر کو قرآن کریم سے آزاد کردے'' (نعوذ باللہ) اس کے نتیجے میں عربی زبان کی بقا ناممکن ہوگئی تاہم خانقاہوں اور علمائے دین کے ایک مخصوص طبقے کی وجہ سے ایمانی حرارت باقی رہی اور عربی زبان بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی، باوجودیکہ استعماری طاقت نے دینی عربی مدارس کا خاتمہ کردیا، اقتصادی طور پر الجزائری قوم کو مفلوک الحال بنادیا اور ساتھ ہی انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے ان کا انتشار واختلاف بڑھادیا اور جہالت، فقر اور فرقہ واریت کو ان پر مسلط کردیا، جہالت کی وجہ سے ان میں اپنے وجود کا شعور نہیں رہ گیا، فقر نے ان کو مفلوج اور عمل سے فارغ بنادیا، اور ان میں فکر اور قوت عمل مفقود ہوگئی، گروہ بندی اور فرقہ واریت نے الجزائر کی قوم کی اجتماعی قوت وصلاحیت سلب کرکے اسے تباہی کے دہانے پر پہنچادیا، یہ صورت حال منصوبہ بند طور پر اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ الجزائر اور مغرب کی سرزمین عیسائی مذہب

☆ استاد شعبۂ عربی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز، حیدرآباد۔

اور فرانسیسی زبان اور مغربی تہذیب وثقافت کا گہوارا اور فرانس ہی کا ایک حصہ ہوجائے، ان حالات میں نہ عربی زبان کی تعلیم کا امکان رہ گیا تھا اور نہ کسی سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ عربی میں کچھ لکھے گا اور جو کچھ لکھتا بھی تھا تو اس میں استعماری طاقت کے ظلم واستبداد کے خلاف اس کے احساس وتاثر کا آجانا یقینی تھا، جس کے بعد اس کو اور اس کے خاندان کو مبتلائے مصائب ہونا پڑتا تھا۔

لیکن یہ فطرت کا اصول ہے کہ کسی قوم کو جب دبانے اور مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ظلم وستم حدِ انتہا کو پہنچ جاتا اور ناقابل برداشت ہوجاتا ہے تو وہ ظلم وطغیان کے خلاف اٹھنے اور ابھرنے کی کسی نہ کسی طرح کوشش کرتی ہے، یہی صورت حال الجزائر میں پیش آئی، عیسائیت کی یلغار نے دینی حمیت اور ایمانی حرارت رکھنے والوں کو جب بہت بے چین کردیا تو انہوں نے مکاتب اور مدرسے قائم کرنے کی طرف توجہ دی، ۱۹۱۳ء میں تبسہ شہر میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ وجود میں آیا، اسی طرح عمر راسم نے اپنی آواز بلند کرنے کے لیے اور قوم کی رہبری کے لیے سب سے پہلا عربی اخبار ''جریدۃ الجزائر'' ۱۹۰۸ء میں جاری کیا، بعض علما نے الجزائر سے مشرق کا سفر کیا، ابوطیب العقبی، البشیر الابراہیمی، عبدالحمید بن بادیس اور دوسرے علما نے عربی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت سے مشرق میں جاکر خاطر خواہ استفادہ کیا، واپس لوٹے تو اپنے علم وشعور سے اہل وطن میں بیداری پیدا کی، اس سے قبل ۱۹۰۳ء میں محمد عبدہ نے جزائر کا دورہ کیا جس کی وجہ سے مشرق ومغرب کے درمیان گہرا ربط پیدا ہوا، الجزائر اور مغرب کے نوجوانوں میں دینی اور اسلامی رنگ چڑھا، بہت سے نوجوان بہتر اور اعلیٰ تعلیم کے لیے تونس گئے اور جامع زیتونیہ میں داخلہ لیا، دینی اور علمی اعتبار سے الجزائر کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اس زمانے میں الجزائر سے باہر تعلیم کے لیے سفر کرنا آسان نہیں تھا، طاہر بن عبدالسلام نے لکھا کہ اس دور میں الجزائر سے تونس کا سفر چین کے سفر سے کم دشوار نہیں تھا، لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تعلیم کی طرف رجحان بڑھا، زندگی میں نئی تبدیلی آئی اور ذہنی بیداری کا دور شروع ہوا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں الجزائر کا ماحول علمی، ادبی، ثقافتی اور دینی اعتبار سے بہت پست تھا، شروع میں بیداری کی رفتار بھی اس لیے بہت سست رہی کہ پورا معاشرہ خواب غفلت

میں مبتلا تھا، دینی روح مسخ ہوگئی تھی، خالص دینی عنصر مفقود ہوگیا تھا، جاہلانہ رسم و رواج اور عادات و اطوار نے معاشرہ کی کایا پلٹ دی تھی، جب دینی اور علمی بیداری آئی تو ادبا اور شعرا نے معاشرہ کی خرابیوں کو موضوع سخن بنایا، اپنی تحریروں میں جہالت پر سخت تنقید کی، ان ہی دنوں ادبی و علمی محفلوں کے انعقاد کا آغاز ہوا، اس سے بھی قومی بیداری میں اضافہ ہوا، قسطنطنیہ میں ''نادی صالح بای''، یعنی بای ایسوسیشن قایم ہوئی تو لوگ اس میں شریک ہوکر اجتماعی موضوعات پر گفتگو کرنے لگے اور مجلسوں میں ادبا و شعرا اپنی کاوشیں پیش کرنے اور موجود جاہلانہ رسم و رواج پر اظہار خیال کرنے لگے، محمد المولود الموہوب اس وقت کے نامور شاعر اور ادیب تھے، انہوں نے اپنے اشعار میں اس معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے اور محمد الہادی الزاہری نے اپنی کتاب ''شعراء الجزائر فی العصر الحاضر الجزء الثانی'' میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

محمد الہادی الجزائری نے یہ بھی تحریر کیا کہ پہلی جنگ عظیم کے حالات نے الجزائر کے نوجوانوں میں استعماری طاقت کے خلاف ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کردیا، مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امیر عبدالقادر نے استعماری طاقت کے خلاف جو علم بغاوت بلند کیا، اس کے بعد سے یہ تحریک اپنا کام کرتی رہی لیکن ۱۹۱۹ء تک کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی، پہلی جنگ عظیم کے بعد اس انقلابی تحریک میں شدت پیدا ہوئی اور ذہنی بیداری بھی آئی ''جمعیۃ العلماء المسلمین'' کی ایک اہم شخصیت شیخ مبارک علی نے محمد الہادی الزاہری کی کتاب کو نوجوان نسل کی پہلی کاوش قرار دیا اور اس کی جدت اور نوجوانوں میں ولولہ پیدا کرنے کے رجحان کی بڑی تحسین کی، اس کتاب میں شاعری کا جو نمونہ پیش کیا گیا اس میں جدت، زبان و بیان اور فکر و خیال کے معیار میں بلندی صاف طور پر محسوس ہوتی ہے، یہ کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں الجزائر میں علم و فن، زبان و ادب اور سیاسی انقلاب کے نئے باب کا آغاز تھی۔

محمد المولود بن الموہوب اور دوسروں کی شاعری نے اپنے وقت کے معاشرتی حالات کی جو تصویر کشی کی ہے، اس کی تفصیلات اس دور کے جراید ''الذبیش'' اور ''کوکب افریقیا'' میں بھی ملتی ہیں، اس طرح الجزائر میں جدید عربی شاعری بیسویں صدی کے آغاز میں وجود میں آئی جس میں اجتماعی اور معاشرتی مسایل کو شاعری کا موضوع بنایا گیا، استعماری طاقت کی وجہ سے معاشرہ

میں جو زبوں حالی آئی اس کا ذکر بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں کے شعرا نے خاص طور پر اپنے کلام میں کیا ہے، اس میں زندگی کا احساس پایا جاتا ہے، استعماری طاقت کے پیدا کردہ درد کرب کے اثر سے زندگی میں جو بے کیفی اور مایوسی چھاگئی تھی، اس کا احساس نئے دور کی ابتدائی شاعری میں پایا جاتا ہے لیکن اسی مایوسی میں زندگی کی نئی علامت بھی وجود میں آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، قوم کی عام مایوسی کے اظہار کے ساتھ شاعر نئی زندگی کا احساس بھی دلاتا ہے، محمد المولود ابن الموہوب نے اپنے ایک قصیدہ میں کہا:

☆ ہم اپنے عزایم سے زمین کے خزانے تلاش کرتے ہیں اور جھوٹے مکاروں کی کامیابیوں کو باطل قرار دیتے ہیں۔

☆ اے سنو! یہ اسلام اس اللہ کا دین ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔

☆ اسلام ہم کو علم حاصل کرنے اور فایدہ مند زندگی کی تلاش کا حکم دیتا ہے۔

☆ اسلام نے دنیا اور آخرت کو یکجا کیا، نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر غور و فکر کرو۔

☆ سچائی اس میں ہے کہ نفس کو اوہام و خرافات سے آزاد اور فساد سے دور رکھا جائے۔

الجزائر میں جدید عربی شاعری کی داغ بیل اور فصیح زبان کے استعمال میں ''جمعیۃ العلماء المسلمین'' کی تحریک نے اہم کردار ادا کیا، اس تحریک کی بنیاد پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۳۰ء میں پڑی اور اس سے وابستہ افراد نے ۱۹۲۴ء میں ''جمعیۃ الاخاء العلمی'' کی صورت میں فصیح زبان کے استعمال اور معاشرہ کی اصلاح کی طرف توجہ دی، غیر سرکاری مدارس قایم کیے، مساجد میں قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کے حلقۂ درس قایم کیے، قرآن کریم کی تعلیم نے خود بہ خود فصیح اور صحیح عربی زبان کی تعلیم کی طرف راغب کردیا اور نوجوان صحیح عربی زبان سے آشنا ہونے لگے، اس طرح صحیح عربی زبان کے استعمال و تحفظ کی صورت نکلنے کے ساتھ ذہنی بیداری بھی عام ہوئی ''جمعیۃ العلماء المسلمین'' کی اس کاوش کا اثر الجزائر کی جدید ادبی تحریک پر پڑا اور عربی زبان کی نئی زندگی اور نئی ادبی کاوشوں کو الجزائر سے باہر بھی محسوس کیا جانے لگا، جورج حداد نے جنوبی امریکا میں اپنے ''مجلۃ القلم الحدیدی المہجریۃ'' میں تحریر کیا کہ ''مسلمان قرآن کریم پڑھنے کی وجہ سے جس بہتر انداز میں عربی زبان لکھتے ہیں عیسائی نہیں لکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ قرآن کریم نہیں پڑھتے ہیں اور

اس کے اسلوب پر غور وفکر نہیں کرتے ہیں'' (جریدۃ الشہاب، الجزء الثالث، مارس ۱۹۳۰ء)، ''جمعیۃ العلماء المسلمین'' کی خدمات کی وجہ سے فصیح عربی زبان الجزائر کی سرزمین پر عام ہوئی اور مجلات اور جراید میں جو زبان وادب استعمال کیا جانے لگا اس کے متعلق ادیب ''احمد زکی مبارک'' نے ''ھنا الجزائر'' جریدہ میں تحریر کیا کہ ادب جزائر کی سرزمین میں بلند مرتبہ تک پہنچ چکا ہے اور اس کی آواز الجزائر سے باہر دوسرے عرب ممالک میں بھی سنائی دینے لگی ہے اور عرب ممالک کے مجلات میں وہاں کے ادبا کی ادبی تحریریں نظر آتی ہیں۔

عمر بن قدور (۱۸۸۶-۱۹۳۲) کے مقالات ''اللواء'' (مصر) التقدم (تونس) الحضارۃ (قسطنطنیہ) اور دوسرے متعدد رسایل میں شایع ہوتے رہے، انہوں نے الجزائر کے دار السلطنت سے ''جریدۃ الفاروق'' ۱۹۱۳ء میں جاری کیا جس کو الجزائر کی سرزمین پر عربی صحافت کی قیادت کا شرف حاصل ہے۔

محمد السعید الزاہری کے مقالات ''الفتح، المقتطف اور الرسالہ'' میں شایع ہوتے رہے، الطاہر بن عبد السلام نے ''جریدۃ النہضۃ التونسیۃ'' میں سیاسی کالم نگار کی حیثیت سے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں کام کیا۔

ان ادبا کی کاوشوں اور تحریروں نے زبان وادب اور ثقافت کی بہت بڑی خدمت انجام دی لیکن ان سب نے عربی زبان اور دینی تعلیم کی جو تحریک شروع کی تھی ان سے بھی کسب فیض کیا، جمعیۃ العلماء المسلمین کے نائب صدر البشیر الابراہیمی نے معیاری زبان کے استعمال پر پوری توجہ کی اور ''جریدۃ الشہاب''، جس کے وہ مدیر تھے نیز ''جریدۃ البصائر'' میں اس موضوع پر خاص طور سے مضامین لکھے، اس کا اثر اہل قلم اور قاری دونوں پر پڑا، عبد الحمید بن بادیس نے قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ قدیم ادبی وشعری سرمایہ سے استفادہ کے لیے اپنی قوم کو راغب کیا، عہد جاہلی سے لے کر عہد عباسی کے شعرا وادبا کی تحریروں کے مطالعہ کی وجہ سے زبان وادب دونوں کا معیار بلند ہوا، اس طرح دوسرے ادبا اور شعرا نے شاعری میں جدت کی روح پھونکنے کی کوشش کی، محمد العبد آل خلیفۃ نے نوجوان شعرا کو تجدیدی رجحان پیدا کرنے کی تاکید کرتے ہوئے تحریر کیا:

☆ میں جدید ادب کو حسن ودلآویزی سے آراستہ پاتا ہوں۔

☆ قدیم ادب کو اپناؤ! اس میں زبان کی شیرینی اور معنی کی گہرائی پائی جاتی ہے۔

شاعری میں نئے رجحانات خاص طور سے اس وقت سامنے آئے جب الجزائر کے نوجوان شعرا نے مشرق یعنی مصر وشام کے ادبا وشعرا کی تحریروں سے استفادہ کیا، خاص طور سے وہ نوجوان جنہوں نے طلب علم کے لیے تونس، مصر اور مراکش کا سفر کیا، الہلال، المقتطف اور المنار نے خاص طور سے علم وادب کی نئی روشنی شمالی افریقہ میں پھیلائی، اس طرح مشرق کے مجلات و جراید کے نئے افکار اور نئے رجحانات سے اہل جزائر نے بھی روشنی حاصل کی، اس کے باوجود تجدید کی روح پوری طرح پروان نہیں چڑھ سکی اس لیے کہ نئے تنقیدی افکار اور تنقیدی مباحث نے جنم نہیں لیا اور جو تنقیدی معرکہ آرائی مشرق میں بیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائی تک عام تھی یہاں اس طرح کی تنقید کا وجود نہیں تھا۔

رمضان حمود (۱۹۰۵-۱۹۲۸) شاعر ہونے کے ساتھ ناقد بھی تھے، انہوں نے ان شعرا کے کلام پر تنقید کی جو تقلیدی رجحان کے حامل تھے، اپنے تنقیدی خیالات میں اس بات پر زور دیا کہ شاعری میں نئے رومانوی افکار وخیالات کا اظہار اور جدت ضروری ہے اور دوسری جگہوں کے ادب میں پائے جانے والے رجحانات سے استفادہ کر کے اس دور کی عربی شاعری میں نئے تجربے کی بھی ضرورت ہے، انہوں نے خاص طور سے فرانسیسی رومانوی شاعری کی روشنی میں انقلابی شاعری کی ترجمانی کی اور خود بھی شاعری میں نیا تجربہ کیا، ان کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرانسیسی انقلابی شاعر ''وکتور ہیوگو'' سے انہوں نے اثر قبول کیا ہے، اس کے علاوہ مدرسہ الدیوان اور مہجری شاعری اور تنقید نے بھی الجزائر کے شعرا کو متاثر کیا، الہادی السوی، محمد السعید آل خلیفہ، مفدی زکریا، الامین العمودی اور محمد صالح خبشاس وغیرہ قدیم طرز سخن کے دلدادہ تھے لیکن انہوں نے بھی اس تجدید واصلاح کا اثر قبول کیا اور وطنیت اور قومیت کے تصور سے بھی جو الجزائر کی جدید شاعری کی بنیادی طاقت وروح ہے، اس سے بھی ان شعرا کا کلام مالا مال ہے۔

محمد السعید محمد علی خلیفۃ جسے امیر شعراء الجزائر کہا گیا ہے، اس کی شاعری کا بنیادی موضوع عربی قومیت ووطنیت اور اصلاح معاشرہ ہے، اس نے وطن کی آزادی کے لیے استعماری طاقت کے خلاف پوری قوت کے ساتھ اپنے احساسات کا اظہار کیا، دونوں جنگ عظیم کی درمیانی

مدت میں اس نے جو شاعری کی وہ الجزائر کی قوم کے لیے قابل فخر ہے، اس میں قوم کو نئی راہ دکھائی گئی اور الجزائر میں اسلام کے شان دار ماضی اور معاشرہ میں اسلامی زندگی کی نمایاں خصوصیت کو بڑے پر [illegible] اور دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے، عربی زبان و ثقافت کے تاب ناک ماضی اور تاب [illegible] کی بات پرجوش انداز میں کہی گئی ہے، فرانسیسیوں کے جھوٹے دعووں کا مذاق اڑایا گیا ہے، ان امور کے علاوہ اس کی شاعری میں فلسفہ و حکمت اور اخلاق کا موضوع بھی شامل ہے، اس کی انقلابی شاعری نے الجزائر کی سیاسی، اجتماعی اور معاشی زندگی میں انقلاب برپا کیا اور عبدالحمید بن بادیس کی رہنمائی میں جو اسلامی فکر اور اسلامی تصور حیات ابھرا تھا اس کی عکاسی کی ہے، اس لیے بیک وقت وہ اسلامی، قومی اور عربی قومیت کا شاعر کہلایا، فکر و خیال کی وسعت اس کی شاعری کی روح ہے، اس نے ''مسرحیۃ بلال'' کے نام سے جو ڈرامہ شعر کے قالب میں پیش کیا وہ اس کی قادر الکلامی کی دلیل ہے، معانی اور مضامین کے اعتبار سے اس کی شاعری میں جدت پائی جاتی ہے، مہجری شاعری کا تاثر بھی اس کی شاعری میں موجود ہے لیکن زبان و بیان اور اسلوب میں کلاسیکی عربی شاعری کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے، اس کے باوجود اس کی شاعری رومانوی بھی ہے۔

الجزائر کا انقلابی شاعر مفدی زکریا کو شاعر الثورۃ الجزائریۃ کہا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اس کی شاعری سیاسی انقلاب کی ترجمان ہے، اس میں قومی آزادی کی جو روح کارفرما ہے وہی اس کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے، اس کا ایک دیوان ''اللهب المقدس'' یعنی ''مقدس شعلہ'' ہے، اس میں آزادی کی جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے جو اشعار کہے ان سے واقعی آزادی کی جنگ کا شعلہ تیز سے تیز تر ہوگیا، اس شاعری نے الجزائر کی قوم میں ایک نئی روح پھونک دی، ۱۹۰۰ء کے قید و بند کے درمیان کہا ہوا اس کا ایک پرجوش قصیدہ الجزائر کی آزادی کے متوالوں کے لیے قومی ترانہ کی شکل اختیار کرگیا، اس قصیدہ کا عنوان ''قسما بالنازلات'' ہے، اس کے ایک بند کا ترجمہ اس طرح ہے:

> تباہ کرنے والے مصائب و آلام...... اور جوش مارنے والے پاکیزہ خون کی قسم، بلند و بالا پہاڑوں پر چمکتے ہوئے جھنڈے (کی قسم)۔
>
> ہمارے سامنے زندگی یا موت (دونوں میں سے کسی ایک کا سوال ہے)، ہم نے اسی بات کا پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ الجزائر زندہ (قوم کی حیثیت سے زندہ) رہے گا تم سب اسی بات کی گواہی دو۔

غرض الجزائر کی سرزمین میں تجدید کی آواز بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سنی گئی، خاص طور سے فرانسیسی انقلابی رومانی شاعری نے نوجوان شعرا کو متاثر کیا، اگرچہ قدیم طرز فکر کے ادبا و شعرا نے اس کی مخالفت بھی کی، احمد رضا حوحو جو قصہ نگاری میں الجزائر میں سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں انہوں نے اس تجدید کی مدافعت کی لیکن تجدید کے ساتھ اعلیٰ اقدار اور قدیم فن کی روایت کو برقرار رکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی، اس کے باوجود رومانوی انقلابی تحریک اتنی طاقت ور تھی کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد الجزائر میں عربی شاعری تجدید کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

رمضان حمود نے الشہاب جیسا مجلہ نکالا جو محققین شعرا اور ادب و فن کا ترجمان تھا، اس میں شوقی کے خلاف فروری ۱۹۲۷ء میں ''حقیقۃ الشعر و فوائدہ'' کے عنوان سے ایک سخت مضمون لکھا اور بتایا کہ جو حقیقی احساسات و جذبات کی عکاسی کرے وہی دراصل شاعری ہے، وہ حقیقی وجدان و جذبات سے عاری شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا، اس دور کے شعرا میں محمد البشیر العلوی، احمد سحنون اور مبارک الجلواح نے رمضان حمود کی رومانوی شاعری کی پیروی کی جس نے الجزائر کی سرزمین کو اپنی شاعری اور مقالات کے ذریعہ شعر کے نئے مفہوم سے آشنا کیا تھا، محمد البشیر العلوی نے احمد بن ذباب کی شاعری پر ''وحی الشاعر'' اور ابو مدین الشافعی التلمسانی کی شاعری پر ''الشعر والنفس'' کے عناوین کے تحت الشہاب میں مضامین لکھے اور ان تنقیدی مضامین میں رومانوی شاعری کی جو حقیقی احساسات و جذبات کی ترجمان تھی، تعریف کی اور اسی کو حقیقی شاعری بتایا۔

ان کے علاوہ عبداللہ شریط نے اپنے دیوان ''الرماد'' کے مقدمہ میں، محمد الاخضر السائحی اور الطاہر بوشوشی نے اپنی تحریروں میں اور ابوالقاسم سعد اللہ نے اپنے دیوان ''ثائر وحب'' میں شعر کی تعریف اور اس کی خصوصیات پر تنقیدی اصول و نظریات پیش کیے، انہوں نے بھی انقلابی رومانوی شاعری ہی کو بہتر شاعری قرار دیا، اس کے باوجود تمام شعرا نے رومانوی شاعری ہی کو اپنا شعار نہیں بنایا، گو ان کی شاعری میں دوسرے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں لیکن چوں کہ رومانوی شاعری داخلی جذبات و احساسات اور وجدان کے اظہار کا ذریعہ تھی اس لیے آزادی سے قبل یہی صنف شاعری عام تھی۔

شعرانے عربی شاعری کے معانی میں جدت اور احساسات و جذبات کی ترجمانی کی جانب ہی توجہ مبذول نہیں کی بلکہ شعر کی ہیئت اور خارجی پہلو میں بھی تجدید کا آغاز کیا، رمضان حمود پہلا شاعر ہے جس نے شعر مرسل میں طبع آزمائی کی، وزن اور قافیہ سے آزاد شاعری کو بھی نئے تجربہ کے طور پر آزمایا، اس نے ۱۹۲۸ء میں الجزائر کی سرزمین پر آزاد عربی شاعری کی بنیاد ڈالی، اس کا قصیدہ ''فاجعۃ قلبی'' جریدہ ''وادی میزاب'' کے اگست ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شایع ہوا، اس کے نزدیک جذبات کی سچی تصویر کشی کے لیے اس قسم کی شاعری روا ہے، قصیدہ کے ابتدائی اشعار اس طرح ہیں:-

انت یا قلبی فریدی الالم والاحزان
ونصیبک من الدنیا الخیبة والحرمان
انت یا قلبی تشکو هموما کبارا وغیر کبار
انت یا قلبی مکلوم ودمک الطاهر یعبث به الظهر الجبار
ارفع صوتک للسماء مرة بعد مرة
وقل اللهم انا للحیاة مرة
اعنی اللهم علی اجتراعها
وامددنی بقوة فانی غیر قادر علی احتمالها
اللهم انها مرة ثقیلة فلیس لی فیها طریق

الجزائر کی سرزمین کا عربی شاعری کا یہ درخشاں ستارہ رمضان حمود صرف بائیس سال کی عمر میں اس دار فانی سے چلا گیا، اس میں غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت تھی، اس کا ذہن جس قدر تجدیدی تھا، اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو شاید الجزائر کا عظیم ترین شاعر ہوتا، عبدالحمید بن بادیس نے جریدہ ''الشہاب'' میں تحریر کیا:

''یہ نوجوان ابھرتا ہوا ادیب الجزائر کی سرزمین میں ادبی بیداری لانے والوں میں ایک اہم شخص تھا، اگر وقت نے اسے موقع دیا ہوتا تو ادب میں صحیح معنی میں نابغۂ روزگار ہوتا''۔

محمد ناصر نے اپنی کتاب ''الشعر الجزائری الحدیث'' میں اسے زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

رمضان حمود کے بعد کسی شاعر کے کلام میں ہیئت میں تبدیلی نظر نہیں آتی، اس کے انتقال کے تین دہائی کے بعد آزاد شاعری کا تجربہ ابوالقاسم سعد اللہ نے ۱۹۵۵ء میں کیا اور ۲۲؍مارچ ۱۹۵۵ء کو ''طریقی'' کے عنوان سے قصیدہ لکھا جو شعر کی ہیئت میں الجزائر کی سرزمین پر ایک نیا تجربہ تھا، اس طرح عربی شاعری کا قافلہ نئے رجحانات اور نئے تجربات کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

المغرب الاقصیٰ۔مراکش

بیسویں صدی سے قبل مراکش کی سرزمین پر شعر و ادب کی حالت تونس اور الجزائر سے مختلف نہیں تھی بلکہ مغرب کی ثقافتی وسماجی حالت تونس ہی کی حالت کی بازگشت سمجھی جاتی تھی، جہالت، خرافات اور پس ماندگی معاشرہ کی علامت بن گئی تھی، دین کے نام پر جاہلوں کی شعبدہ بازی نے معاشرہ کو خواب غفلت میں مبتلا کر دیا تھا، عوام میں صحیح دین اور صحیح دینی واسلامی شعور نہ ہونے کی وجہ سے کسی فکری احساس کا پایا جانا ممکن نہیں تھا، اس کے علاوہ سیاسی طور پر فرانس اور اسپین کی استعماری طاقتوں نے اسلامی وعربی تہذیب وثقافت کو مٹا کر فرانسیسی زبان وادب اور تہذیب وثقافت کا بول بالا کرنے کی جو کوشش کی اس نے معاشرہ کو ذہنی اور علمی طور پر مفلوج کر دیا تھا، علما اور دانش وروں کی تعداد محدود تھی، یہی لوگ استعماری طاقت کے خلاف قوم میں شعور پیدا کر سکتے تھے لیکن حکومت کی طاقت ایسی تھی کہ مصلحین اور مفکرین کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی تھی، ان ہی حالات میں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی آواز مراکش تک پہنچی، یہاں تک کہ جامعۃ القروین کے علما اور دانش ور بھی اس آواز سے مانوس ہوئے، اس کا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ میں تعلیم کی طرف توجہ دی جانے لگی اور اس کی اصلاح کا کام شروع ہوا، معاشرہ کی اصلاح زبان وادب ہی کے ذریعہ ہوتی ہے، دینی روح کی بقا کے لیے عوام میں جذبہ وشعور پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ شاعری سے کام لیا گیا ہے، مراکش میں خانقاہی نظام اور دینی مکاتب کے علما کے ذریعہ دعوت وارشاد کا کام اس دور میں جاری تھا، عربی زبان وادب کی زیادہ تر خدمت مذہبی طبقہ نے ہی انجام دی، اس

لیے اس دور کی شاعری میں زیادہ تر وعظ اور پند ونصائح کی باتیں پائی جاتی ہیں، اس میں تخیل یا وجدان اور احساس کا عنصر عام طور پر مفقود ہے، زبان اور اسلوب میں رکاکت اور ابتذال بھی کثرت سے ہے۔

انیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں کی ابتدا میں مغرب کے ثقافتی تعلقات مشرق سے بہت کمزور پڑ گئے تھے اس لیے کہ فرانسیسی استعماری حکومت نے ہر طرح سے عربی زبان وادب اور ثقافت کو مٹانے کی کوشش میں اس بات کی طرف بھی توجہ دی کہ مغرب کے عوام کا رشتہ مصر اور مشرقی ممالک سے نہ رہے تاکہ ان ممالک میں جو ثقافتی ترقی ہورہی تھی اس سے یہ نابلد رہیں مگر اس کے باوجود اصلاحی تحریکوں کی آواز مغرب تک پہنچتی رہی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد وہاں کے عوام میں بھی عرب قومیت کا شعور بیدار ہوا، اس کی وجہ سے ترقی پذیر مشرقی عرب ممالک سے ثقافتی روابط وتعلقات کی راہیں ہموار ہونے لگیں اور مغرب کے علما، شعرا اور ادبا کو استعماری طاقت کے ظلم وزیادتی کا احساس ہونے لگا اور وہ اپنی زبان وثقافت کی بقا کی فکر کرنے لگے، ان حالات نے شعرا میں نیا شعور پیدا کیا، انہوں نے سماجی اور سیاسی افکار وخیالات اور احساسات کو شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی اور معیاری زبان اور کلاسیکی شاعری کے اسلوب کو فکر وخیال کی ادائیگی کے لیے استعمال کیا، الطاہر احمد مکی رقم طراز ہیں:

''ان کی شاعری وجود میں آئی تو زبان جمود سے آزاد ہوگئی، اسلوب کی خامیاں بھی دور ہوئیں اس میں جہالت سے آزادی اور سماجی پس ماندگی اور خرافات سے نجات کا پیغام دیا گیا، بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں محمد السلیمان ابن الموّاز اور محمد الجزولی کی شاعری میں ان کا ذکر ملتا ہے، ان کے اور دوسرے شعرا کے کلام میں اصلاحی افکار ونصائح بھی پائے جاتے ہیں اور کچھ ہی شعرا کی شاعری ان خصوصیات سے عاری تھی''۔ (الشعر العربی المعاصر، ص ۱۲۲)

مشرقی ثقافت سے استفادے اور شعری وادبی دائرے میں وسعت کے بعد مغربی شعرا نئے افکار اور نئے اسالیب سے آشنا ہوئے، اس کے علاوہ لازمی فرانسیسی زبان کی تعلیم، فرانسیسی ادب وثقافت کے عام ہونے اور فرانسیسی شاعری سے واقفیت کی وجہ سے بھی شعرا کے فکر وخیال

میں وسعت پیدا ہوئی، نئے مضامین اور شاعری کے نئے رجحانات سے وہ واقف ہوئے اور ان معلومات کا اثر عربی شاعری میں جدت کی شکل میں ظاہر ہوا، سب سے بڑھ کر یہ کہ غیر ملکی فرانسیسی حکومت چوں کہ معاشی، سماجی، ثقافتی، دینی اور سیاسی ہر اعتبار سے اہل مغرب کی شناخت کو مٹانے کی کوشش کررہی تھی اور اس کے لیے اس نے ہر قسم کے ظلم واستبداد کو روا رکھا تھا، اس لیے اس صورت حال نے مغرب کے خواص وعوام دونوں کو بے چین کردیا اور ان میں غلامی کی زنجیر سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جو کشمکش شروع ہوئی اور اس نے جو احساس پیدا کیا شعرا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، عام لوگوں کے مقابلے میں شعرا زیادہ شدید الاحساس ہوتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری کو آزادی کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور استعماری طاقت کے خلاف اپنی پرجوش شاعری کے ذریعہ قوم میں آزادی کی روح پھونک دی، معاشرے کی جہالت، اقتصادی بدحالی اور خرابیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا تاکہ قوم میں ذہنی اور فکری بالیدگی پیدا ہو، ان شعرا نے معیاری زبان اور بلیغ اسالیب کی طرف بھی توجہ دی تاکہ عربی زبان میں علم وادب اور فکر وفن پروان چڑھ سکے، غرض استعماری طاقت کے خلاف رونما ہونے والے اس انقلاب نے شاعری کو نئی جہت دی، اس سلسلے میں عبدالکریم الخطابی کا نام قابل ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ مغرب کی جدید شاعری میں قومی، وطنی اور اجتماعی افکار وخیالات کی آواز زیادہ طاقت ور ہوگئی ہے اس لیے کہ اس میں جذبات واحساسات کی شدت اور تخیل کی جولانی ہے، دوسرے اصناف شاعری میں یہ بات کم تر ہے، محمد بن الیمنی الناصر، المختار السوسی، محمد القروی پہلی جنگ عظیم کے بعد کے نمایندہ شعرا ہیں اور ان تمام شعرا میں شاعر الشباب المغربی کہے جانے والے محمد علال الفاسی کی شخصیت اور شاعری بہت نمایاں ہے، دینی تحریکات سے وابستہ شعرا دینی حمیت رکھنے کی وجہ سے استعماری طاقت کے خلاف زیادہ پرجوش تھے اور معاشرہ کی اصلاح کی فکر بھی ان میں زیادہ تھی، محمد علال الفاسی ان ہی شعرا میں تھے، وہ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی دینی دعوت وتحریک سے متاثر تھے، فرانسیسی زبان وادب کے مطالعہ نے ان میں بڑی وسعت فکر پیدا کردی تھی، انہوں نے تعلیم نسواں اور معاشرہ کی اصلاح کو بھی شاعری کا موضوع بنایا اور وطن کی آزادی کے لیے ان کی شاعری بے نیام تلوار تھی، احمد قبش تحریر کرتے ہیں

''علال ایسا شاعر ہے، جس کی شاعری، اسلوب اور افکار میں جدت پائی جاتی ہے، اس نے شاعری میں ایسے افکار و خیالات پیش کیے جن کی طرف دوسرے شعرا کی توجہ نہیں گئی، علال الفاسی مغرب کے ان اولین شعرا میں سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے قدیم عربی شاعری کے اسلوب اور قصیدے کے اصول و ضوابط سے الگ ہوکر قافیہ اور وزن سے آزاد شاعری کو ترجیح دی۔

علال الفاسی نے مضامین میں جدت کے ساتھ ہیئت میں جدت کی اور مغرب کی شاعری کو اوزان و قوافی سے آزاد کرایا، اس کی شاعری موضوعی شاعری تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں رومانوی شاعری بھی اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے چوں کہ اس نے فرانسیسی شاعری اور اس کے رجحانات کا مطالعہ کیا تھا اس لیے مغربی عربی شاعری کو خاص طور سے اعلیٰ معیار کی جدید شاعری کی شکل میں پیش کیا''۔

مغرب کے شعرا میں ایک نام عبداللہ کنون الحسنی کا بھی ہے وہ بڑا ادیب و شاعر ہے، ''النبوغ المغربی فی الادب العربی'' اور دوسری اہم کتابوں کی وجہ سے وہ بہت مشہور ہوا، اس کی شاعری کا اسلوب قدیم ہے اور وہ قدیم طرز فکر کے شاعر ہیں لیکن زبان و بیان اور اسلوب کی پختگی اور شاعرانہ احساس کی وجہ سے اس کی شاعری اہم ہے، اس نے خود شعرا کو تجدید کے لیے دعوت سخن دی ہے یہ اس کا بڑا وصف ہے۔

مغرب میں تونس اور الجزائر کی طرح قومی شاعری کی طرف زیادہ توجہ دی گئی لیکن شعرا نے رومانیت، اشتراکیت، رمزیت اور دوسرے رجحانات کو بھی آگے بڑھایا اور عربی شاعری کو جدید رنگ و آہنگ سے متعارف کرایا، بیسویں صدی میں مغرب میں جن شعرا نے عربی شاعری کو مشرق کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا ان کی تعداد کئی سو ہے، ان شعرا کی شاعری افکار و خیالات، زبان و بیان اور اسالیب کی پختگی کے اعتبار سے کسی طرح مشرقی شعرا کی شاعری سے کم تر نہیں ہے، مراکش کے ادبا اور شعرا کی اب تک کم از کم ۶ -ببلوگرافی شایع ہوئی ہے، میرے سامنے محمد قاسم اور احمد سجال کی تیار کردہ کتاب ''ببلوغرافیا الشعر العربی الحدیث بالغرب'' (مراکش) ہے، اس میں انہوں نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۹۶ء تک کے مطبوعہ دواوین کی تعداد ۳۴۵ بتائی اور ۱۹۷ شعرا کے ۳۴۵ مطبوعہ دواوین کی

تفصیل درج کی ہے جو مراکش اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک میں شایع ہوئے ہیں، ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ شعرا کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کے دواوین مخطوطات کی شکل میں ہیں یا جرائد اور مجلات کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں، محمد قاسمی نے تحریر کیا کہ:

''شعرا کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کی شاعری مخطوطات کی شکل میں ہے یا جرائد و مجلات میں بکھری پڑی ہے اور کسی نے ان کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی''۔

اصل فن اور شاعری وہی ہے جو آفاقی اقدار کی حامل ہو اور شاعری کی زندگی کے بعد بھی اپنے اعلیٰ اقدار، فن کی اعلیٰ روایت، افکار و خیالات کی گہرائی اور زبان و بیان کی پختگی کی وجہ سے زندۂ جاوید ہو، اس دور میں جن مشاہیر اور اہم شعرا کی شاعری اپنے فن و اسلوب کی پختگی اور جدت کی وجہ سے نمایاں ہے اور ان کی موت کے بعد بھی اپنے فن کا جادو جگا رہی ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ''احمد المجاطی، ادریس الجامی، ثریا الساقط، عبدالرحمن جی، عبدالکریم بن ثابت، عبداللہ راجع، عبداللہ کنون، عبدالمجید بنجلون، علال الفاسی، قدور الورطاسی، محمد مکوار، محمد الجزولی، محمد الخمار الکنون، محمد عبدہ بوزولیع، محمد عزیز الحبابی، مصطفیٰ المعداوی، احمد برکات، احمد الجوماری، عبداللطیف الفوادی''۔

سرزمین مغرب مراکش میں تعلیم اور تہذیب و ثقافت کی ترقی کی وجہ سے صنف نازک میں بھی علمی وادبی شعور بیدار ہوا اور انہوں نے زندگی کے دوسرے گوشہ کے ساتھ شعر و ادب کے میدان میں بھی اپنا جوہر دکھایا، صنف نازک کی جدید عربی شاعری بھی قابل توجہ ہے، جن شاعرات نے بیسویں صدی میں شاعری میں اپنے نقوش چھوڑے ان میں سے چند نام یہ ہیں: ''آسیۃ الہاشمی البلغیثی، أمل الاخضر، بھیۃ الفلامی ادیب، ثریا السقاط، ثریا ماجدولین، زہرا ناصری، سعاد فتاح، سعاد الناصر (ام سلمیٰ) عزیزۃ اضحیۃ عمر (شتواری) فاطمۃ الزہرا بنت عدو الادریسی، ملیکۃ العاصمی، وفاء الغمرانی''۔

جو رجحانات مشرق میں عام ہوئے ان کو مغرب کے شعرا نے بھی اپنا کر شاعری کا بہتر نمونہ پیش کیا لیکن مراکش کی آزادی سے قبل کی شاعری پر وطنیت اور قومیت کا موضوع غالب رہا، اس لیے کہ استعماری طاقت کی فرعونیت کی وجہ سے وطن کی آزادی کا احساس مغرب کے ہر فرد کی

نفسیات پر حاوی تھا، محمد المعطی القرقوری نے تحریر کیا:

''جدید شاعری نے مغرب کے انسان کے سیاسی، اجتماعی اور نفسیاتی اظہار میں بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے اور اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے''۔

(مجلۃ الاقلام، العدد ۴ نومبر ۱۹۷۴ء ص ۷۸، بحوالہ الادب العربی المعاصر فی المغرب الاقصیٰ ص ۱۱۴، ۱۱۵)

تعلیم اور اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے عدل و انصاف مغرب میں ناپید ہوگیا تھا اور طبقہ واریت نے معاشرہ کے کمزور طبقہ کو کچل کر رکھ دیا تھا، اس بات کے احساس نے آزادی سے قبل ہاں اشتراکی طرز فکر کو عام کر دیا تھا اور شعرا اشتراکی خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے، آزادی کے بعد چوں کہ کسی استعماری طاقت کے ظلم و استبداد کا خوف نہیں رہ گیا تھا، اس لیے سماجی عدل و انصاف اور اقتصادی اصلاحات اور معاشرہ کے زبوں حال طبقے کی خوش حالی کی فکر ان کی شاعری کا موضوع بن گیا اور یہ واقعہ ہے کہ کمزور طبقہ ہر حال میں کچلا جاتا ہے، اس لیے معاشرہ کی حقیقت حال کا اظہار ہی واقعیت کہلایا، شعرا نے اپنے اردگرد کے ماحول میں زندگی کا جو حال دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اس احساس کو جذبات کی شدت اور تخیلات کی قوت کے ساتھ پیش کیا، اس لیے آزادی کے بعد اشتراکیت اور واقعیت مغرب کی عربی شاعری میں جدید شاعری کی حیثیت سے زیادہ سامنے آئی اور شعرا کی بڑی تعداد نے ایسی ہی شاعری کی، اور آزادی کے بعد جس کثرت سے دواوین شایع ہونے لگے اس سے پہلے اس قدر کثیر تعداد میں دواوین وجود میں نہیں آئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے افراد نے فرانسیسی زبان و ثقافت کو ترجیح دی اور اس طبقہ کے افراد نے فرانسیسی زبان میں اپنی بات اور شعر کہنے کو قابل فخر سمجھا لیکن وہ طبقہ جو واقعی عربی اور عربی تہذیب کا پروردہ ہے اس کے سامنے اظہار خیال کا بہتر ذریعہ عربی زبان ہی ہے اور یہ طبقہ چوں کہ اعلیٰ طبقہ کی زیادتیوں کا شکار تھا، اس لیے اشتراکی نظریۂ فکر کو ہی اپنے احساسات کے اظہار کے لیے مناسب سمجھتا تھا، اس کے نزدیک معاشرہ میں عدل و انصاف اشتراکی طرز زندگی سے ہی حاصل ہوسکتا تھا، آزادی کے بعد جن شعرا نے اس طرز فکر کی ترجمانی کی اور ان کی شاعری کو ناقدوں نے قابل اعتبار سمجھا ان میں: مصطفیٰ المعداوی، عبداللطیف اللعبی، محمد الحبیب فرقانی،

محمد بنیس، الحجام علال، احمد ائیت وارھام، محمد الشیخی، محمد القماص عرباوی ادریس، عبدالقادر المسکینی، احمد الطریق، صلاح علواش، الحسین القمری، محمد السابلی، عبداللطیف زروال، محمد الجتوری، عائشی عبدالسلام، بوستی حاضی، حسن الغرفی، منیب البوریمی، مصطفیٰ الجزولی، قدور الورصاسی، عبدالحمید الجوہری، احمد الدکالی، بحراوی حسن، الھلالی ابوشعیب، احمد نغاش، السولامی عبدالسلام اور ان کے علاوہ دوسرے شعرا ہیں لیکن ایک اہم بات یہ ہے کہ مغرب کا کوئی بھی شاعر شاعری کے کسی ایک رجحان کا پابند نہیں ہے، اسلامی افکار اور دوسرے رجحانات بھی ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں، ان شعرا کے کلام میں فکری گہرائی ہے اور اسلوب میں عام طور پر رمزیت ہے، الدکتور سید حامد نساج جو بڑے ناقد ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''الادب العربی المعاصر فی المغرب الاقصیٰ'' میں تفصیل سے اشتراکی طرز شاعری کا جائزہ لیا ہے ان شعرا کے اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی شاعری فکر و خیال، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کی اور مشرق کی شاعری سے کسی طرح کم تر نہیں ہے بلکہ بعض شعرا کی شاعری خیالات کی نزاکت، زبان کی دلآویزی اور رعنائی و جمال کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

''کنز الرموز''

از ڈاکٹر محمد معتصم عباسی آزاد☆

(۲)

حج کے بارے میں کہتے ہیں کہ در و دیوار کے طواف کا نام حج نہیں ہے کیوں کہ خدا نہ تو کسی جہت کا پابند ہے اور نہ اہل دل کا کعبہ سنگ وخشت سے ہے بلکہ دل ہے، لہذا دل طلب کر، حج کی نیت گناہوں سے توبہ ہے، احرام باندھنے کا مطلب انسانی عادتوں کو ترک کرنا ہے، اہل دل کا صفا و مروہ بیم و رجا ہے، اس کے درمیان سعی کرنا چاہیے، بغیر نفسانی خواہشات اور اپنی خودی مٹائے حج کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔

زیں گریباں ہر کہ سر بری کند　　　هر زماں صد حج اکبر می کند

از گریبان ہوا احرام گیر　　　پس طواف کعبۂ اسلام گیر

ہر زمان سعی باید با صفا　　　در صفا و مروۂ خوف و رجا

آتش اندر خرمن پندار زن　　　آنگہی لبیک عاشق و ارزن

چوں پدید آید حریم و بارگاہ　　　نفس خود قرباں کنی در پیش شاہ

زیں بہ پست مرکب توفیق کنی　　　پس طوافِ کعبہ تحقیق کنی

از جہت بگذر کہ آنجا کبریاست　　　پس بہر جانب کہ رو آری رواست

کعبۂ مرداں نہ از آب و گل است　　　طالب دل شو کہ بیت اللہ دست

اس کے بعد ''علم'' کا ذکر کرتے ہیں کہ آدمی کو علم ہی کی بہ دولت دوسری مخلوقات پر برتری حاصل ہے، ورنہ وحشی قومیں بھی آدم ہی کی نسل سے ہیں، طاعت عمارت ہے علم اس کی بنیاد ہے، عمارت بے بنیاد کے تعمیر نہیں ہوتی، علم ہی سے عمل نافع ہوتا ہے، عمل اگر علم سے پیوست نہ ہو تو جبہ و

☆ جی، ۲۷ وسفینہ اپارٹمنٹ، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ۔

دستار دانش مندی کی دلیل نہیں ہے، اگر تو راہ معنی میں دانا ہے تو زمانے کے دریا میں مثل صدف کے ہے کہ تجھ میں علم کا موتی پوشیدہ ہے، ظاہری علم سے مادی ضروریات پوری ہوتی ہیں لیکن معنوی علم دل و جان کا رہبر ہے، علم ہی ہر موجودات کے اثبات کی نفی کرتا ہے تا کہ معبود کی ہستی تک تیری رسائی ہو سکے۔

ای گرامی جوہری عالی نسب　　　دانش آموزی شناسائی طلب

مردم از دانش ورای عالم اند　　　ورنہ مردم ہم ز نسل آدم اند

ای بداغ جہل خود را سوختہ　　　جز فراموشی دلت نا موختہ

علم بنیادست و طاعت خانہ ای　　　بی اساسی کہ بود کاشانہ ای

علم باید تا عمل گنجی بود　　　زانکہ بی دانش عمل رنجی بود

چوں بنا دانی خود بینا شوی　　　زود بر تخت خرد والا شوی

گر عمل با علم تو پیوند نیست　　　جبہ و دستار دانش مند نیست

در رہِ معنی اگر دانا شوی　　　چوں صدف در قعر ایں دریا شوی

علم صورت پیشۂ آب و گل است　　　علم معنی رہبر جان و دل است

نفی کنی اثبات ہر موجود را　　　تا بدانی ہستی معبود را

چوں یقیں دانی کہ دانندہ خداست　　　ذات پاکش را مگو چون و چراست

حضرت او برتر از حد و مثال　　　در نگنجد صورت وہم و خیال

ذات او را نیست نقصان و زوال　　　نی سکون و نی تحرک را محال

اس کے بعد ''توحید'' کی بابت بیان ہے، طالب جب دوئی سے گذر کر وحدت تک پہنچتا ہے تو اسے توحید کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے، معرفت کے حال کی شرح کسی سے بھی ممکن نہیں ہے، اسی کا کمال عاجزی ہے، معرفت ہی شناسائی (عشق) کی اصل ہے، اسی سے جسم دل کو بینائی کا نور عطا ہوتا ہے، توفیق خداوندی کی رہنمائی کے بغیر اس کے اسرار کو سمجھنا مشکل ہے، حق کو حق ہی کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے، جو اپنے نفس ہی کو نہ پہچانے وہ معنی تک کیسے پہنچ سکتا ہے، نفس جان و دل کا مرکب ہے اور بغیر مرکب کے راہ طے نہیں ہو سکتی۔

چوں بہ وحدت در گذشتی از دوئی   عارف اسرار توحیدش توئی
کس نداند شرح حالِ معرفت   عاجزی آمد کمالِ معرفت
معرفت اصل شناسائی بود   چشم دل را نور بینائی بود
گر نبودی بخشش حق رہنموں   شر ہیچوں را کہ بُردی نی بروں
عارف از ہیچکاری بر نساخت   زانکہ حق را جز بحق نتواں شناخت
عارف و صوفی بکوتش در گذار   ذات پاکش از دو عالم بی نیاز
چوں تو نفس خویش را نشناختی   مرکب معنی بصحرا تاختی
نفس توسن مرکب جان و دلست   راہ بی مرکب بریدن مشکلست

اس کے بعد "دل" کے بارے میں بتاتے ہیں کہ دل اسرار حق کا مخزن ہے اور بازار حق میں جان کی خلوت ہے، محرمی کی بارگاہ کا امین ہے، آدمی کی کارگاہ عمل کی اساس ہے، بلبل جان کا نشیمن ہے، معرفت کا شاہباز اسی ہاتھ بیٹھتا ہے، اس کے اندر رحمانی اور شیطانی دونوں وصف پائے جاتے ہیں، روحِ قدسی کو اس کی ہم نشینی حاصل ہے، عقل کل اس کے در کی پاسبان ہے، دریائے دل کی غواصی کرنے والے کو سینکڑوں ہزار دُرِ معنی حاصل ہیں، دل در حقیقت اسی وقت دل ہے جب اسے معنیِ دل حاصل ہو، اگر معنی دل پر دسترس نہ ہو تو دل دل نہیں خانۂ دیو ہے، اگر انسان وجود میں حق کا پرتو نہ ہوتا تو فرشتے اسے سجدہ کیوں کرتے، آفرینش کو اسی کے جام سے حیات ملی ہے، اس کا نام اسی کے باعث آدم معنی ہے، عارفوں کو اس پر بڑی حیرت ہے کیوں کہ بغیر تحقیق کے وہ کسی کو نہیں پہچانتا، حق الیقین اس کی آنکھ کا سرمہ ہے، اسی کی ذات نقد امانت کا امین ہے، اس آستانے تک پہنچنے کے لیے مصطفیٰ کی رہنمائی ہی بہتر ہے۔

دل چہ باشد مخزن اسرار حق   خلوتِ جاں برسرِ بازار حق
دل امین بارگاہ محرمیت   دل اساس کارگاہ آدمیت
بلبل جاں را بباغ او نشست   شاہباز معرفت او را بدست
روحِ قدسی ہمنشیں در برش   عقل کلی پاسبان در برش
ہمنف شیطانی و روحانی ازو   ملک جسمانی و روحانی ازو

ہر کہ او غواص دریائے دلست   صد ہزاراں دُر معنی حاصلست
گر ترا معنی دل حاصل شود   آں زماں دل در وجودت دل شود
در بدیں معنی نہ نداری دسترس   دل مخوانش خانۂ دیوست و بس
آفرینش را حیات از جام او   آدمِ معنی ازاں شد نام او
عارفاں را حیرت است ازوی بسی   زانکہ نشناسد بہ تحقیقش کسی
چشم او را سرمۂ حق الیقین   دست او نقد امانت را امین
وصفِ او از ہرچہ گویم برترست   آستاں را مصطفیٰ خوش رہبرست
نی بہ غفلت ایں حکایت بر خوری   باز کن چشم خرد تا بنگری

اس کے بعد "عقل" کی تعریف ہے کہ نور عقل سے بہرہ مند شخص ہی سارے عالم میں دانش مندی میں سربلند ہوتا ہے، ساری دنیا میں عقل ہی کا خطبہ جاری ہے، سارے دانے اسی کے دام کے لیے ہیں، عقل ہی اللہ کے وجود پر حجت ہے تاکہ زمانہ اس پر کوئی عذر نہ پیش کر سکے، عقل پر مغرور نہ ہونے والا ہی در حق پر سجدے سے مجبور نہیں ہے، عقل کے بغیر دانائی ممکن نہیں ہے، معرفت کو اس کے بغیر توانائی نہیں ملتی، قلعۂ دل کی عقل ہی دن و رات پاسبانی کرتی ہے، عقل کے بغیر روح طفل بے زبان ہے، عقل کو جب نور شرع سے بینائی حاصل ہو جاتی ہے تو بڑے بڑے داناؤں سے بھی بلند ہو جاتی ہے، علت کے بعد معقول کو دیکھنا ہی معقولیت کی دلیل ہے، یفعل اللہ ما یشاء خدا کا وصف ہے، وہ جو کچھ بھی کرے اس کو روا ہے۔

ای ز نور عقل گشتہ بہرہ مند   در ہمہ عالم بدانش سربلند
در ولایت خطبہا بر نام او   ایں ہمہ دانہ برائی نام او
حجۃ اللہ عقل آمد ہوشدار   تا نیازی ہیچ عذری روزگار
از در حق سجدۂ مجبور نیست   ہر کرا عقل آمد و مغرور نیست
آدمی بی عقل دانائی نیافت   معرفت بی او توانائی نیافت
روز و شب در قلعۂ دل پاسباں   روح بی او ہمچو طفل بی زباں
چو بہ نور شرع بینا گشت عقل   از ورای ملک دانا گشت عقل

آنکہ علت دید پس معقول دید　　ہرچہ دید از دیدۂ معقول دید
ای بجہل آوازہ در کشور زدہ　　از گریبان ہوا سربر زدہ
ظلمت ہستی ترا در راہ دیں　　در حجاب افگند از نور یقیں
یفعل اللہ ما یشاء وصف خداست　　ہرچہ خواہد می کند او را رواست
قادر است او بر وجود بیش و کم　　جملہ را باشد ہمی جف القلم
بادہ گر واجب بود بر ذات او　　پس دو واجب میشود اثبات او
گر نداری دیدۂ احول بہ بیں　　نور حق بی اول و آخر بہ بیں
ایں حکایتہا نباید سرسری　　تا نیابی غفلت ایں رہ بسپری

اس کے بعد ''تصوف'' کا ذکر ہے، تصوف کے ملک کا محرم نگین عالم میں مثل مہر کے ہے، تصوف سے بڑھ کر کوئی راہ نہیں ہے، تصوف چار حرف (ت،ص،و،ف) سے بنا ہے جس کے معنی توبہ، صدق اور اس کی شرط وفا ہے، اس کے بعد فنا کو فنا میں فنا کرنا ہے، تصوف کی ابتدا صدق، فقر اور افتقار ہے، اس کی انتہا تسلیم اور ترک اختیار ہے، جب تک سالک اپنی خودی میں قید ہے یہ راہ طے نہیں ہوسکتی کیوں کہ اس منزل پر پہنچنے کے لیے جان فدا کرنا پڑتا ہے، اس کے لیے پہلے دل کو خیر و شر سے پاک اور عادت طبعی سے کنارہ کشی کرنی ہوگی، اپنی صفات اور نفس کافرکیش کو آگ لگانا ہوگا، علم تحقیق کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا راستہ معلوم کرنا ہوگا، ظاہر و باطن میں حق سے معاملہ صاف رکھنا ہوگا، صوفیوں کو صفا سے کام ہے، جو لوگ مودت میں مصفا ہیں وہی حق کے مقرب ہوتے ہیں، اپنے ارادے میں خدا کے حکم کے پابند ہوتے ہیں، ان کے نزدیک فقر و غنا یکساں ہوتا ہے، عقل بینا حق تک ان کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ کمال معرفت سے سرفراز ہوتے ہیں، ظاہر صوف اور باطن بے صفا راہ مصطفیٰ ترک کرنے والوں کا شعار ہے۔

ہر کہ در ملک تصوف محرم است　　ہمچو مہر اندر نگین عالم است
ہیچ راہی از تصوف بیش نیست　　چار حرف اندر تصوف بیش نیست
توبہ و صدق است و شرط آں وفا　　پس فنا کردن فنای در فنا
اولش صدق است و فقر و افتقار　　آخرش تسلیم و ترک اختیار

تا تو در بند خودی مشکل رسی　　جاں فدا کن تا بدیں منزل رسی
صاف کن دل را نخست از خیر و شر　　پس بنہ خوی طبعی راز سر
آتش اندر زن صفات خویش را　　پس ہوای نفس کافرکیش را
علم تحقیق از دل آگاہ گیر　　شارع شرع رسول اللہ گیر
صاف شو با حق نہاں و آشکار　　صوفیان صاف را است کار
چوں مصفی در مودت گشتہ اند　　حضرت حق را مقرب گشتہ اند
چوں حجاب خود کرامت یافتند　　شاہراہ استقامت یافتند
در ارادت بستۂ حکم خدا　　نزد شاں یکساں شدہ فقر و غنا

اس ضمن میں حضرت بایزید بسطامی کی دو حکایتیں بیان کرتے ہیں کہ ایک روز شیخ بایزید اسی نکتہ کو ایک مجلس میں بیان کررہے تھے، ان کی باتیں سن کر ایک خود پرست شخص اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا اور ان سے کہا کہ جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک عمر گذار دی، اس فکر میں ایک رات بھی غافل نہیں سویا، بہت ریاضت و عبادت کی لیکن اس اسرار سے واقف نہ ہوسکا، باوجود کوشش کے اپنے مدعا کو نہ پہنچ سکا، شیخ بسطام نے جواب دیا کہ اب تک عبادت کے پردے میں تو خودپرستی کرتا رہا، اگر اسی طرح دوسو سال اور عبادت کرے تب بھی، جب تک اپنی خودی میں قید ہے عبادت بے سود ہوگی، مقصد حاصل نہیں ہوگا کیوں کہ تیری عبادت حق کے لیے نہیں، نمود و نمایش کے لیے ہے۔

آں شنیدستی کہ روزی بایزید　　کرد زیں معنی یکی نکتہ پدید
از میان جمع مرد خود پرست　　چوں شنید ایں حرف از جائی جست
گفت من عمری دریں غم بودہ ام　　روز کم خواجہ شبی نغنودہ ام
گرچہ طاعت کردہ ام بسیار من　　نیستم واقف بدیں اسرار من
مو بہ مو از کامہا بشناختم　　آنچہ میگوئی نشاں کم یافتم
پیر بسطامی جوابش داد و گفت　　خود پرستی کردہ ای اندر نہفت
گر کنی طاعت دو صد سالہ دگر　　تا تو در بند خودی سودا شمر

خواجہ تو در بند بازاری ہنوز — مبتلائے ریش و دستاری ہنوز
بوالہوس تا در حجاب خویش بود — این سخن نہ مرہم این ریش بود
خوب گفت آں مقتدای اہل دل — عشق بازی نیست کار آب و گل

دوسری حکایت بھی اسی ضمن میں ہے کہ پیر بسطام کی بات کسی طالب کے دل کو لگ گئی، اس نے خود پرستی سے توبہ کرلی، ہر نیک و بد کو خود سے بہتر سمجھنے لگا، اس کے نفس نے خاکساری اختیار کرلی، اتفاق سے اس کا گذر ایک دریا کی طرف ہوا، ایک مست دیوانے کو دیکھا کہ نہایت خستگی کی حالت میں خاک پر پڑا ہوا ہے، اس کے زار و نزار جسم پر ایک مختصری گدڑی تھی عقل سے بیگانہ تھا، قول و فعل دونوں نامعتبر تھے، اس نے جب اس کی نقاب اٹھائی تو اس کے نفس نے سرکشی شروع کردی اسے اس حالت میں دیکھ کر طالب کو خود اپنے نفس پر قابو نہیں رہا، اس نے دل میں سوچا کہ اگرچہ میں نے بھی خاکساری اختیار کرلی ہے لیکن اس دیوانے سے بہتر ہوں، یہ سوچ کر دریا کی طرف بڑھ گیا، اسے دیکھ کر دریا کی موج بیتاب ہوگئی چوں کہ تیراکی سے آشنا نہیں تھا، موج اسے بہالے گئی، پانی جب سر سے اونچا ہوگیا تو اس نے بہت ہاتھ پیر مارا، بالآخر وہ خود بین مرد مایوس ہوگیا، لہٰذا نصیحت کرتے ہیں کہ عشق کے مزاج میں خوش خوئی پیدا کرنی چاہیے اور خاکساری میں خود کو گلیوں کے کتوں سے بھی بدتر سمجھنا چاہیے۔

طالبی را بر دل آمد این سخن — کم نزدی ہر جا کہ بودی خویشتن
نیک و بد را بہتر از خود داشتی — نفس خود را خاک رہ پنداشتی
از قضا دیوانہ ای را دید مست — برلب دریا چو خاک افتادہ پست
عقل از و بگریختہ رفتہ خرد — زندگی آمیختہ باکیش مرد
دلق او چوں صورت او مختصر — قول او چوں فعل او نا معتبر
چوں نقاب از چہرۂ او باز کرد — نفس دونش سرکشی آغاز کرد
گفت اگرچہ زیر خاک آمد سرم — از چنیں دیوانہ جای محترم
چوں نکرد از دیو نفس خود حذر — سوی آب آمد چوں با از رہگذر
موج آبش بیں چہ بیتابی نمود — چوں نبودش آشنا آتش ربود
دست و پای زد چوں آب سرگزشت — مرد خود بیں از ہمہ نو مید گشت

بر مزاج عشق خوش کن خوی را — بہتر از خود داں سگان کوی را

اس کے بعد تصوف کے مقامات کا ذکر ہے، مقامات کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ مدرسۂ عشق کے نوآموزوں کو پہلے عشق کے ابجد سے آشنائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیوں کہ اول اور آخر کو اگر وہ دیکھنا چاہیں تو تمام نقوش اسی لوح پر ثبت ملیں گے، اگر ان کی آنکھ حرف اول کے نور سے روشن ہوگئی تو ابجد تحقیق میں وہ دانا ہوگئے، تیرے پیچھے اجل کا سیلاب لگا ہوا ہے لہٰذا خواہشات کا بیج اپنے وجود کی زمین سے نکال دے۔

ای نو آموزاں دبیرستان عشق — جہد کن تا بگردی ابجد خوانِ عشق
نقشہائے اولین و آخریں — اندریں لوحست اگر خواہی بہ بیں
گر ز حرف اولیں بینا شوی — ابجد تحقیق را دانا شوی
در قفای تست سیلاب اجل — برکش از و آب و گلت بیج اجل

اس کے بعد مختلف مقامات کی تعریف ہے، پہلا مقام "توبہ" ہے، کسی بھی عمارت کے استحکام کے لیے اس کی بنیاد کا مضبوط ہونا ضروری ہے، اگر بنیاد مستحکم ہے تو کہنہ ہوجانے پر بھی کم خراب ہوگی، جب تیرا گذر اس کوچ (تصوف) میں ہو تو اس منزل یا عمارت کی بنیاد "توبہ" ہے، توبہ کا مطلب گذشتہ زندگی پر اظہار پشیمانی اور حق کے دروازے پر نئے سرے سے مسلمان ہونا ہے، توبہ اپنے نفس پر قابو پانے اور شریعت کو اس کا پاسبان بنانا ہے، بندۂ حق بن کر زندگی بسر کرنے اور بیم و رجا کے درمیان خود کو برقرار رکھنے کا نام ہے، عام لوگ خراب کاموں سے توبہ کرتے ہیں لیکن خواص دوست کے لیے اپنے نفس سے توبہ کرتے ہیں۔

منزلی خواہی کہ ماند برقرار — اولش بنیاد باید استوار
گر بنای خانہ ات محکم بود — چوں کہن گردد خرابی کم بود
چوں ترا در کوئی این آمد گذر — توبہ را بنیاد این منزل شمر
توبہ چوں باشد پشیماں آمدن — بردر حق نو مسلماں آمدن
نفس را محسوس خود پیداشتن — شرع را چو پاسباں بگذاشتن
بندۂ حق بودن و خوش زیستن — در امید و بیم خود نگریستن

عام را توبہ زکار بد بود   خاص را توبہ زیار خود بود
گفت پیری کند ریں رہ پیشواست   توبہ کن از ہرچہ آں غیر خداست
توبہ را بگذار و زاں ہم توبہ کن   روشنیست اہل ورع زا ایں سخن

اس کے بعد کہتے ہیں کہ جب تو ''توبہ'' کے مقام پر پہنچ گیا تو گویا شاہ راہ راستی پر آ گیا، اچھے برے کی صحبتوں میں بیٹھنا اب کم کردے تا کہ تجھے معدن مقصود حاصل ہو سکے، کسی لمحہ یاد خدا سے غافل نہ ہو، نفسانی خواہشات اور دنیا کی فکر میں خود کو مستغرق نہ کر، نفس کو کوی حق کی بندگی پر مامور رکھ تا کہ حق کی جانب پوری طرح متوجہ ہو سکے، نام و ننگ کے بارے میں گفتگو نہ کر، تیری ہر صلح اور جنگ صرف خدا کے لیے ہو، ظاہر و باطن میں سوا حق کے ہر چیز کا منکر بن جا، دل کی پرہیزگاری کی یہی شرط ہے۔

چوں مقام توبہ را آراستی   باز باید شاہ راہ راستی
کم نشیں در صحبت ہر نیک و بد   تا بیابی معدن مقصود خود
یکدم از یاد خدا غافل مباش   در غم و اندوہ آب و گل مباش
نفس خود را بندہ کن در کوی حق   تا بکلی باز گردی سوی حق
گفتگو کم کن برائے نام و ننگ   جز خدا پیدا نہ کن ہر صلح و جنگ
جز بحق منکر نہاں و آشکار   ایں بود شرط دل پرہیزگار

اس کے بعد ''فرقت دنیا'' کا ذکر آتا ہے کہ طالب جب دنیا کے دام سے رہا ہو جائے تو اسے زہد کی تلوار سے اپنی خودی کے بند کو کاٹ دینا چاہیے، اپنے دل اور ہاتھ دونوں کو تہی کرے. زہد کی شرط یہ ہے کہ دونوں جہاں سے دل یک بارگی سرد ہو جائے، زہد شمع ہے اور دل اس کا پروانہ ہے، زہد ہر خردمند کے مقصد کی اساس ہے، عشاق کی خودی جب فنا ہو جاتی ہے تو زہد کا مقام ان کے لیے کمتر ہو جاتا ہے۔

دام دنیا چوں برافگندی زپیش   پس بہ تیغ زہد بشکن بند خویش
زہد را خواہی کہ بنہادی نہی   ہم دل و ہم دست را باید تہی
شرط زہد آں باشد ای دانندۂ مرد   کز دو عالم دل کنی یکبارہ سرد

زہد چوں شمعست دل پروانہ ایست   زہد اساس کار ہر فرزانہ ایست
عاشقان کز خود قدم برداشتن   زہد را کمتر مقام انگاشتند

اپنی بات کی تائید میں شیخ ابوبکر شبلی کی حکایت بیان کرتے ہیں کہ کسی راز جو نے شبلی سے زہد کی تعریف پوچھی، انہوں نے کہا کہ زہد کے قریب نہ جانا، اس میں سوا غفلت کے میں نے کچھ نہیں پایا، تیرا زہد بھی تیرے نفس کا پابند ہے، نفس کی پابندی کب درست ہے، بعض قوم اس سے برتر مقام پر ہے، ان کے لیے خدا کی طرف سے ہر دم دوسرا پیغام ہے۔

گفت با شبلی جوانی راز جوی   زہد را معنی چہ باشد باز گوی
چیست ایں دنیا نہاں و آشکار   ذرہ ناچیز گشتہ در شمار
لاف زہد تو دریں ناچیز چیست   غفلت محض است و کار سرسریست
در حقیقت زہد را معنی بداں   کز دو بیروں نیست کار ایں جہاں
گر بود زہد تو در قسم کسی   ریشخند آرد بروی خود لبی
زہد تو ہم اختیار نفس تست   اختیار نفس کی باشد درست
بعض قومی را مقام برترست   کز خدا ہردم پیام دیگرست

اس کے بعد ''صبر'' کے بارے میں کہتے ہیں اہل دل ہر حالت میں صبر اختیار کرتے ہیں اور اس سے خوش ہوتے ہیں، صبر سے نفس کی گوش مالی ہوتی ہے، یہ عقل کا جوہر ہے، صبر پر قایم رہنا مشکل کام ہے، ہر عاقل میں اس کی لیاقت نہیں ہوتی جو اہل دل بلا میں صابر و شاکر ہوتے ہیں انہیں ہی درگاہ حق سے اس بلا سے رہائی ملتی ہے، ملک صبر کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے ہر رنج اور بلا میں صبر اختیار کرنا چاہیے۔

صبر باید مرد را در ہر چہ ہست   ناتوانند بر در شادی نشست
گوشمال نفس تو صبر است و بس   جوہر عقل است صبر ای بوالہوس
صابر اندر صبر کار مشکلست   ایں سخن نہ لایق ہر عاقل است
در بلا صابر شدہ مردان خاص   لیکن از درگاہ حق جستہ خلاص

اس کے بعد ''فقر'' کا ذکر ہے، فقر نیستی کا حاکم ہے، وجود کے خرمن کو جلا دیتا ہے، فقر

توحید کی پہلی منزل ہے، سواحق کے اس کے نزدیک ہر چیز باطل ہے، فقر درحقیقت ایثار کا نام ہے جو شخص اس راستہ پر چلتا ہے اسے اغیار کا خیال نہیں رہتا، فقر اختیار کرنے والا دنیاوی فکر سے بے نیاز اور لالچ، خواہش اور غرور وکینہ سے محفوظ رہتا ہے، جن اہل اللہ نے فقر کی راہ طے کی ہے وہ ہمیشہ فقر کی تکلیفوں پر شاکر رہے ہیں۔

چوں صلای فقر در مجلس دہند / طوطیان گفتار شیریں سر نہند
فقر سر دفتر بود و نابود را / فقر سوز و خرمن موجود را
فقر در توحید اول منزلست / ہر چہ خبر حق است نزدش باطلست
در حقیقت فقر جز ایثار نیست / مرد ایں رہ را سر اغیار نیست
فارغ از اندیشۂ دنیا و دیں / ایمن از حرص و ہوا و کبر و کیں
آں جواں مرداں کہ رہ پیمودہ اند / در بلای فقر شاکر بودہ اند

اس کے بعد "شکر" کا مقام آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کی کوئی حد نہیں ہے، ہر شکر کے بعد شکر کرنے والا حیرت میں رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جب نعمت عطا کی ہے تو اس نعمت کا شکریہ فرض ہے۔

حد شکر نداند ہیچکس / حیرت آمد غایت ہر شکر و بس
راست شو چوں نعمتی دادت الہ / شکر نعمت طاعت آمد بیگناہ

اس ضمن میں ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے تنہائی میں خدا سے کہا کہ اے دنیا کے پیدا کرنے والے، زن وفرزند سے مبرا، تیری نعمتوں کا شکریہ کیوں کر ادا کر سکتا ہوں، پہلے تو اس روزی کی نعمت کا شکریہ جو تو نے عطا کی ہے، پھر تیری مہربانی کا شکریہ جو تو نے مجھ پر کی، خدا کی طرف سے قاصد پیغام لایا اور اس سے کہا کہ ہر طرف سے خدا کا شکر مسلسل ادا ہو رہا ہے چوں کہ تو ہم کو اچھی طرح پہچانتا ہے، اسی لیے ہماری نعمتوں کا اس قدر شکریہ ادا کر رہا ہے۔

آں یکی با حق چہ گفت اندر نہاں / ای پدید ادا رندۂ ہر دو جہاں
ای مبرا از زن و فرزند و جفت / چوں توانم شکر نعمتہاست گفت

شکر در حق نعمت روزی نخست / ہم دوبارہ نعمتی از لطف تست
پیک حضرت دادش از ایزد پیام / گفتش ای از تو بود شکر مدام
چوں تو مارا ایں قدر بشناختی / شکر نعمتہای با پرداختی

اس کے بعد خوف ورجا کا بیان ہے کہ مرغ ایمان کے خوف ورجا دو پر ہیں اور بے پر کے مرغ کو اڑانا غلط ہے، بندے کو چاہیے کہ امید وبیم کے درمیان اپنی عاجزی کا اظہار کرتا رہے، صرف امید سے انسان بے ادب ہو جاتا ہے اور بے ادب کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اسی طرح بیم بھی اگر حد سے زیادہ ہوگا تو انسان کا جگر خون ہو جائے گا، لہذا دونوں کے بین بین رہنا چاہیے ورنہ دین ودل میں خلل پیدا ہوگا۔

مرغ ایماں را دو پر خوف رجاست / مرغ را بی پر پرانیدن خطاست
بندۂ را باید کہ در امید و بیم / نامۂ بیچارگی خواند مقیم
مرد از امید گردد بی ادب / بی ادب سیلی خورد در روز و شب
بیم اگر اندازہ بیروں می شود / مرد را از غم جگر خوں می شود
چوں بہ بیم افسرد گردد آب و گل / وحشت انگیز و جان آب و گل

اس ضمن میں حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شیریں مقال سے کسی بیوقوف نے پوچھا کہ میں نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا کیسے ہنسوں کہ میں صاحب ماتم ہوں، سوگوار، نیم جان اور غم گین ہوں، دور دراز کی منزل در پیش ہے اور ہر قدم کے نیچے سینکڑوں نشیب وفراز ہیں، کتنے ہی دروازے کھٹکھٹائے لیکن خوف ہے کہ اپنے مقصد کو نہیں پہنچ سکوں گا، میری فریاد سے ایک عالم کا خون ہو گیا لیکن میرے درد کے "مقبول" ہونے کی خبر نہیں آئی پھر بھی مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، لاتقنطوا کی آیت اسی لیے ہے، ارباب یقین کی امید یہ ہے کہ "خدا کا لطف" عین اس کے قہر میں دیکھے، اس یقین سے سالک رجا کے مقام پر پہنچ جاتا ہے لیکن یہ راز اس وقت تک سمجھنا مشکل ہے جب تک دل غیر حق سے خالی نہ ہو جائے، دل جب غیر حق سے خالی ہو جاتا ہے تو توکل کا نقد اسرار اسے حاصل ہو جاتا ہے۔

ابلہی پرسید ازاں شیریں مقال / ہرگزت خنداں نہ بینم چست حال

گفت چوں خندم کہ صاحب ماتم — سوگوار و نیم جان و پر غم
پیش دارم منزل دور و دراز — زیر ہر گامی دو صد شیب و فراز
حلقۂ درہا زدم بسیار من — لیک ترسانم زختم کار من
عالمی را خوں شد و جان و جگر — از قبول درد کس نامد خبر
رخ بہ نومیدی نمی باید نہفت — آیت لا تقنطوا بہر چہ گفت
لطف حق در عین قہر او بہ بیں — ایں بود امید ارباب یقیں
از یقیں اولی مقام آمد رجا — ما کجا و شتر ایں معنی کجا
چوں تو رخ از غیر حق بر تافتی — نقد اسرار توکل یافتی

اس ک بعد ''توکل'' کے بارے میں کہتے ہیں کہ سالک جب اللہ تعالی کی توفیق سے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیے اور امید کے پیر میں چھبے ہوئے کانٹے کو نکالنے کی اسے خوش خبری دی جاتی ہے۔

مرحبا ای شہسوار تیز گام — چوں بہ توفیقش گذشتی ایں مقام
ای گل خنداں سر از غنچہ برار — باد نو روزست و ابر نو بہار
خار غم بیروں کن از پای امید — چوں نسیم صبح دم دادت نوید

اس کے بعد ''محبت'' کا بیان آتا ہے، محبت کے بیج پر قدم رکھنے والا اس وزیر کے مانند ہے جسے بادشاہ کی دست بوسی کا اعزاز حاصل ہے، وہ اس گہر کے معدن کا مایہ دار ہے، آب حیواں اس کے قبضہ میں ہے، جس کو یہ سعادت مل گئی اس کی خاک پا آسمان کو پہنچ جاتی ہے، محبت کا بلبل مطلق کی لاف زنی کرتا ہے، دن رات انا الحق کا نعرہ لگاتا ہے، محبت ما و من سے بے نیاز ہے، جو بھی حق کا دوست ہوا اپنا دشمن ہو جاتا ہے، محبت جب وحدت کی تلوار کھینچتی ہے تو پھر جس نے بھی اس کے آگے سر اٹھایا سر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، تیغ محبت کے شہیدوں کو حق کی قربت حاصل ہے۔

ہر کرا نطع محبت راہ یافت — ہمچو فرزیں دست بوس شاہ یافت
مایہ دار کیں گہر را معدنست — آب حیوانش بہ زیر دانست
بلبل او لاف مطلق می زند — روز و شب بانگ انا الحق می زند

اول از آدم برآید گفتگو — ورنہ خاکی زا کہ دارد جستجو
گر بہ ایں نوبت ز اول او زدی — پور عمراں طبل ارنی کی زدی
چوں محبت نبارنج از ما و منست — ہر کہ او را دوست خود را دشمنست
چوں محبت تیغ وحدت برکشید — سر نہ بیند ہر کہ آنجا سرکشید

اس کے بعد ''شوق'' کا ذکر ہے، شوق شہباز محبت کے لیے بمنزلۂ پر کے ہے، جان کی حریم انس تک رہنمائی کرتا ہے اگرچہ شوق کا مقام بلند ہے لیکن اس میں خاص و عام برابر ہیں، خداوند جہاں ہر زمانے میں سالکان طریقت کو طریقت میں ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے، اس راہ میں طلب نامناسب ہے کیوں کہ مطلوب خود ہی لا انتہا ہے۔

شوق شہباز محبت را پرست — در حریم انس جاں را رہبرست
شوق را گرچہ بلند آمد مقام — ہست یکساں اندراں رہ خاص و عام
ہستی بخشد خداوند جہاں — سالکان را در طریقت ہر زماں
در طلب ہادی نہایت ناروا ست — ز انکہ مطلوبی ہمی بی منتہاست

اس کے بعد ''اُنس'' کے بارے میں ہے، حسن کی مستی جب عاشق کو بیخود بنا دیتی ہے تو اس کی آنکھ کا پردہ ہٹ جاتا ہے، درمیان میں کسی غیر کا وجود نہیں رہتا، خوف پر امید غا ب آجاتی ہے، اس بساط پر بخشایش کی محفل آراستہ ہوتی ہے جو عاشقوں کے لیے خوشی کا مقام ہے، اس بازار میں پہلے دیوانگی کا سودا ہوتا ہے تب کلیم اللہ کی طرف سے دیدار حق کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے، انس کے چمن کی نسیم جب چلتی ہے تو جسم کے قفس میں جان کا بلبل زمزمہ سنجی کرنے لگتا ہے، اس مقام پر سالک طاعت اور ذکر مدام سے انس کی بہ دولت پہنچتا ہے جو شخص خدا کی یاد سے انس رکھتا ہے اس کے لیے تمکین بحر اور لقا غواصی ہے، صاحب حال کو صفات حق کے نام سے تسکین ملتی ہے۔

مستی حسنش چو بر بودت ز خویش — پردۂ چشمت بر اندازد ز پیش
ہر چہ غیراست از میاں بیروں شود — پس امید از بیم مرد افزوں شود
مجلس بخشایش آمد ایں بساط — عشقبازاں را مقام انبساط
مایۂ سودا دریں بازار خاست — پس کلیم اللہ ز حق دیدار خواست

چوں نسیم ایں چمن پیدا شود　　بلبل جاں در قفس گویا شود
سال اول کہ بشناسد مقام　　انس او با طاعت و ذکر مدام
آنکہ او را انس با یاد خداست　　بحر تمکین است و غواصی لست
آنکہ صاحب حال باشد نام او　　با صفات حق بود آرام او

اس کے بعد "قرب" کا بیان ہے، سالک کو اپنے نفس ظلمانی کے پردے سے باہر آجانا چاہیے تاکہ خدا کی قربت کے لائق ہوسکے، سورج آسمان پر چمک رہا ہے لیکن چشم نابینا کو کیا فایدہ، حق ہم سب سے نزدیک تر ہے لیکن وہی شخص اسے پہچان سکتا ہے جو اپنے سے باخبر ہو، یہ کیفیت تمام تر باطنی ہے یہاں ظاہر کو دخل نہیں ہے، دوست کو دوست کے نام کی پرواہ نہیں ہوتی، پہلے حق کو پہچاننے والی نظر ہونا چاہیے کیوں کہ نور حق ظاہر ہے، اگر کوئی نہ پہچان پائے تو یہ اس کا عیب ہے، اس کا قرب اور تیری دوری خود تیرے ہی باعث ہے، نقصان کے بغیر نفع حاصل نہیں ہوتا۔

از حجاب نفس ظلمانی برآی　　تا شوی شائستہ قرب خدای
آفتاب از آسماں پیدا نمود　　چشم نابینا نمی بیند چہ سود
او بما از ما بسی نزدیک تر　　داند آنکس کوز خود دارد خبر
ایں ہمہ مغزست اینجا پوست نیست　　دوست را پروای نام دوست نیست
دیدۂ حق بیں بباید از نخست　　نور حق پیداست لیکن عیب تست
قرب او دوری تست از بود خویش　　بی زیانی خود نیابی سود خویش

اس کے بعد "قبض وبسط" کا ذکر کرتے ہیں، سالک جب محبت میں پہلا قدم اٹھاتا ہے تو گردش احوال سے اس پر قبض وبسط کی کیفیت طاری ہوتی ہے، جس طرح شرابی شراب سے مست وخراب ہوجاتا ہے، عاشق کا دل بھی شراب عشق کی گرمی سے مست ہوجاتا ہے، اس کے نفس کو سرور حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح شرابی نشہ اترنے پر خمار کی تکلیف سے دوچار ہوتا ہے اسی طرح عاشق کو بھی عشق کی غیرت پیچ وخم میں مبتلا کردیتی ہے اور اس کی ساری خوشی غم میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

در محبت چوں زدی گام نخست　　قبض و بسط از گردشِ احوال تست

کز ...... بر جاناں رسید　　بیدلاں را مژدۂ درماں رسید
شرط باشد ہر کہ می گیرد بدست　　خاک را از جرعہ ساز و نیم مست
غیرت عشقش کند در پیچ و خم　　آں ہمہ شادی بدل گردد بہ غم
چشم او گردد ز باغ روز گار　　ہر یکی را بر جگر صد گونہ خار
نفس و دل را باشد ایں معنی بیاں　　مرغ جاں را برتر آمد آشیاں

اس کے بعد "فنا وبقا" کا بیان ہوتا ہے کہ نیستی اہل دل کی جولان گاہ ہے، عاشقان کامل کی یہی شاہِ راہ ہے، عارف کا دل دوست کا طالب ہوتا ہے، اس کی ہستی پر نور حق کا غلبہ ہوتا ہے، اس کے دست مراد سے فعل حق صادر ہوتا ہے، حق کا پرتو اس کی ذات کا لباس ہوتا ہے جو اسے بحرِ فنا میں غرق کردیتا ہے، وحدت کی تلوار اس کی ہستی کو مٹادیتی ہے، اس کی خودی بے خودی میں بدل جاتی ہے، اس کے وجود میں عشق کا ہنگامہ بپا ہوجاتا ہے، اس کے دل سے دنیا وعقبیٰ دونوں کا خیال نکل جاتا ہے، فنا کو فنا میں فنا کردینے سے وہ حق میں فنا ہوکر بقا کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔

نیستی جولانگہ اہل دل است　　شاہراہ عاشقان کامل است
جانِ عارف دوست را طالب شدہ　　نور حق باہستیش غالب شدہ
فعل حق دست مرادش تافتہ　　نفس او ترکِ ارادت یافتہ
پر بود ذات از لباس کبریا　　کرد او را غرقۂ بحر فنا
تیغ وحدت راندہ بر ہستی او　　بُردہ او را بیخودی از دست او
شور عشق افتادہ در آب و گلش　　نی غم دنیا و عقبیٰ در دلش
چوں فنا کردی فنا را در فنا　　از فنای حق رسیدی در بقا

اس کے بعد "تجلی واسمہا" کا ذکر آتا ہے کہ تجھ پر تیرے اوصاف کا پردہ پڑا ہوا ہے، پہلے اس پردے کو اٹھادے، جب دل نفسانی خواہشات سے پاک ہوجائے گا تو اس میں تجلی کا ظہور ہوگا، انوار تجلی کا نشان دل میں خیال کا بے گمان آنا ہے کیوں کہ اس میں وہم وفہم کی گنجایش نہیں ہے، اس معنی کو عبادت کا لباس نہیں پہنایا جاسکتا، افعال وصفات کے راز سربستہ کو کوئی نہیں کھول سکتا، نہ ذات کے انوار کے پرتو کو ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

پردهٔ تو ہمہ اوصاف تست پرده ہای خویش را بر در نخست
دل چوں از سوادی نفسانی پرست برسر تخت تجلی خوش نشست
چیست انوار تجلی را نشاں انچہ در سر تو آید بی گماں
وہم و فہم انجا نگنجد در خیال نی عبارت را دریں معنی محال
کی کشاید گنج افعال و صفات کی نماید پرتو انوار ذات

اس کے بعد "تجرید وتفرید" کے باب میں چند اشعار ہیں، تجرید کیا ہے، علایق دنیوی سے پاک ہونا اور راہ آزادگاں میں ہوشیاری، خود کو پرندوں کی طرح دانے سے وابستہ نہ کرنا اور اپنوں اور بیگانوں سے بے نیاز ہو جانا، تفرید کی کہ یہ دولت ایک غواص دریا کے اندر اس قدر موتی نکال لیتا ہے جو سالک تجرید میں فرد نہیں ہے، مرد اہل معنی نہیں ہے، مرد فرد وحدت کے نور سے مستنیر ہوتا ہے۔

چیست تجرید از علائق پاک شو در رہِ آزاد گاں چالاک شو
ہمچو مرغاں بستۂ دانہ مباش مبتلای خویش و بیگانہ مباش
بر لب دریا نہ غواصی نگر کو بہ تجرید آورد چندیں گہر
ہر کہ در تجرید مرد فرد نیست در طریقت اہل معنی مرد نیست
مرد فرد از نور وحدت بہرہ مند نی قبول درد خلقش پای بند
عرصۂ میدان او را حال نہ دید او را دیدۂ افعال نہ

اس کے بعد "وجد وجود" کی بابت بیان کرتے ہیں کہ مرغ وجد حق کے آشیانے سے پرواز کرتا ہے، برق کی مانند آتا ہے اور اسی تیز رفتاری سے گذر جاتا ہے، کبھی تو جمال دوست اپنے رخ سے نقاب اٹھا دیتا ہے اور کبھی اس کی غیرت کا جلال حجاب بن جاتا ہے، طالب کا جذبۂ حق اسے اس کی خودی سے محروم کر دیتا ہے اور علّیین کی مسند تک پہنچا دیتا ہے، وہ اس کیفیت سے کبھی مغلوب ہو جاتا ہے، کبھی اس پر غالب آجاتا ہے، جب غالب آجاتا ہے تو اپنی خودی سے آزاد ہوکر حریم قدس میں باریابی پا جاتا ہے۔

مرغ وجد از آشیاں حق پرد ہمچو برق آید بزوری بگذرد

گہ جمال دوست بردارد نقاب گہ جلال غیرتش گردد حجاب
جذبۂ حق گہہ رہاید از خودش تا بہ علّیین رساند مندش
ایں سخن چوں ہمدم طالب شود گاه مغلوب گہی غالب شود
آنکہ غالب شد برست از دام خویش در حریم قدس کرد آرام خویش

اس کے بعد "صحو وسکر" کی تعریف ہے، حال کی مستی ابتلا کا دار ملک ہے، اس کے مُہر بے ششدر (حیرت) میں ہوتے ہیں اور بازی غلط پڑتی ہے، دل بینا کو یہ قدح بھی پینا پڑتا ہے، دریا کا دریا پی جانے پر بھی تشنگی باقی رہتی ہے، اسے اس کا حال دعویٰ سبحانی پر مجبور کرتا ہے جو اس کی پریشانی کا سبب بنتا ہے، کوئے بلا میں جسے دار پر چڑھایا گیا تھا وہ اسی خنجر خونخوار کا مارا تھا، یہ خوف کا محل اور آفت کا مقام ہے، سینکڑوں ہزار ایک لمحہ میں دو نیم کر دیے گئے ہیں۔

حال مستی دار ملک ابتلاست مہر ہا در ششدر و بازی خطاست
ایں قدح را ہم دل بینا کشد تشنہ باشد گرچہ صد دریا کشد
حالتش دعویٰ سبحانی کند عاشق انجا بس پریشانی کند
خستہ ایں خنجر خونخوار بود آنکہ در کوی بلا بردار بود
ایں محل آفتست و جای بیم صد ہزار انجا بہ یک ساعت دو نیم

اس کے بعد "محو اثبات" کے بارے میں کہتے ہیں، طالب کو چاہیے کہ اپنے ورق دل سے حرف نفس کو مٹا دے تا کہ اس پر اثبات حق کی آیات پڑھ سکے، جب تک اسے خود اپنا گمان رہے گا نور یقین سے بہرہ مند نہیں ہوگا۔

محو کنی نفس خود از روی ورق تا بخوانی آیت اثبات حق
ہر کہ او خود را ز کار خود نیافت سر او را عین کار اثبات یافت
ای حسینی قصہ را کوتاہ کن بے حسینی عزم ایں درگاہ کن
درگمان خود چہ باشی پای بند آخر از نور یقیں شو بہرہ مند

اس کے بعد "علم الیقین اور حق الیقین" کے بارے میں بتاتے ہیں کہ علم الیقین تک پہنچنے کے لیے عقل فرزانہ رہنمائی کرتی ہے، دانش کا راستہ جب سلامتی کے ساتھ طے ہو جاتا ہے تو

سالک کو جس چیز کا پہلے علم تھا اسے اب اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جب وہ بحرِ حقیقت کا راستہ پا جاتا ہے تو اسے حق الیقین کا گوہر ہاتھ آجاتا ہے لیکن اس کے لیے خود پرستی چھوڑنا ہوگی اور دونوں جہاں سے بے رخی اختیار کرنا پڑے گی، آنکھ کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ تادیر قایم نہیں رہتا، حق الیقین کو علم الیقین پر فوقیت حاصل ہے، حق الیقین کی سعادت انبیاؑ کو ملی ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنا ہو تو مقام ''لی مع اللہ'' میں دیکھو۔

عقل فرزانہ چو ہستت ہمنشیں　　بازیابی نکتہ علم الیقیں
چوں گذشتی از راہ دانش درست　　خود بہ بینی انچہ دانستی نخست
ای کہ در بحر حقیقت راہ یافت　　گوہر حق الیقین ناگاہ یافت
از دو کون آزاد شد ای خود پرست　　مرغ او بر شاخ او ادنیٰ نشست
انچہ علم عین از و دادش نشاں　　بی نشاں شد نزد او دامن کشاں
منظر حق الیقین بالا ترست　　ایں سعادت انبیا را در خورست
گر حقیقت پرسی از حق الیقیں　　در مقام لی مع اللہ بازبیں

اس کے بعد ''وقت'' کا ذکر کیا ہے کہ جب آئینۂ دل شک سے پاک ہوجاتا ہے تو اس میں انسانوں اور فرشتوں تک کی شکل دکھائی دیتی ہے جو اہل وقت ہیں، وہ وقت سے باہر نہیں دیکھتے، انہیں ماضی و مستقبل کی فکر نہیں ہوتی، وہ جس نے اپنے وقت پر نظر رکھا اس کا وصف ''ما زاغ البصر'' ہے، اگر وقت تیرے موافق ہو تو اس نقد کو بہتر طور پر وصول کر۔

چوں شود آئینہ ات صافی ز شک　　رونماید صورت انس و ملک
اہل وقت از وقت بیروں ننگرد　　نی غم ماضی و مستقبل خورند
آنکہ ہم در وقت خود بودش نظر　　وصف جانش بود ''ما زاغ البصر''
وقت اگر با تو نماید حال تست　　بازیابی نقد وقت خود درست

اس کے بعد ''تلوین و تمکین'' کی تعریف ہے، طالب جب تک صحیح راہ پر نہیں ہوگا، اس کا یوسف (مقصد) اسی طرح کنوئیں میں مقید رہے گا، دورنگی کے سبب حق کا راستہ نظر نہیں آئے گا اور وہ مصر تمکین کا عزیز نہیں بن پائے گا، جب اسے اپنے پر اختیار حاصل ہوگا تو اس درگاہ کا محرم

بن جائے گا۔

ای مسافر تا بہر سو راہ تست　　یوسف تو ہمچناں در چاہ تست
از دو رنگی چوں تو حق بیں نیستی　　زاں عزیز مصر تمکین نیستی
چوں ز دار الملک جاں آگہہ شوند　　شاد و خرم محرم در گہہ شدند

اس کے بعد ''غیب و حضور'' کی بابت بیان کرتے ہیں، طالب کو جب تک نام و ننگ کا خیال رہے گا، وہ اپنی خودی میں گرفتار رہے گا، خودی کے ساتھ محبوب کی گلی میں گذر ممکن نہیں ہے، محبوب کا دیدار ترک خودی کے بعد ہی ممکن ہے، عاشق جب تک خودی سے نزدیک ہے، حرف ''دید'' سے دور رہے گا، حضوری کے لیے خود اپنے سے غیبت ضروری ہے۔

ای اسیر نام و ننگ خویشتن　　بستۂ خود را مدام خویشتن
در نگنجد تا خودی در کوی او　　گم شوی تا خود بہ بینی روی او
تا تو نزدیک خودی ایں حرف دور　　غیبتی باید اگر خواہی حضور

اس ضمن میں حضرت بایزید بسطامی کی حکایت بیان کرتے ہیں کہ کوئی طالب حضرت بایزید کی خدمت میں پہنچا، گھر کا دروازہ بند تھا، اس نے دستک دی اور پوچھا کہ رہبر عالم شاہ بسطام کہاں ہیں؟ بایزید نے کہا کہ اے روشن دل مدت گذر گئی کہ میں خود اس کی تلاش میں ہوں، اس کو پانے کی آرزو میں ساری عمر گذار دی لیکن سارے عالم میں اس کا کہیں پتہ نہیں ہے، ظاہری آنکھوں سے اس کا وجود پوشیدہ ہے، کوئی بھی اب تک بایزید کی نشان دہی نہیں کر سکا۔

رہروی ناگہ بہ نزد بایزید　　چوں در آمد خانہ را بستہ پدید
حلقۂ در زد کہ مرغ دام گو　　رہبر عالم شہ بسطام ''کو''
بایزیدش گفت ای روشندلاں　　سالہا شد تا از وجویم نشاں
در ہمہ عمر آرزو او مراست　　بایزیدی در ہمہ عالم کجاست
ہم بسی چشمی ز پیدا او نہفت　　کس نشان بایزیدی را نگفت

اس کے بعد تلقین کرتے ہیں کہ پاک بازوں نے یہ راہ اسی طرح طے کی ہے، بیخودی کے عالم ہمیشہ خود سے آسودہ رہتے ہیں، اس راہ آنے والے سانپ کی طرح اپنی کینچلی سے باہر

آجاتے ہیں۔

پاکبازاں رہ چنیں بیہودہ اند　　تا دمی بیخود ز خود آسودہ اند

باز گویم در رہش چوں آمدند　　ہچو مار از پوست بیروں آمدند

اس کے بعد ''سمع'' کا ذکر ہے جس میں رمزیہ انداز میں اختلاف کا اظہار ہے، اہل دل کے لیے ضروری نہیں کہ صرف انسان کی خوش الحانی حق تک ان کی رہنمائی کرے، کائنات کا ذرہ ذرہ حمد وثنا میں مصروف ہے، اگر جذبہ صادق ہے تو بلبل کی نوا رمزی سے بھی عاشق کے دل پر وہی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جو کسی خوش لحن انسان کی آواز سے طاری ہوتی ہے، جو لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں وہی تکلف سے کام لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح حق تک ان کی رسائی ہوجائے گی، یہ لوگ ویرانوں کے چغدوں کی طرح ہیں جو باغ میں بلبل کی زمزمہ ریزی سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے اپنے خرقوں کو دام نغمہ بنالیا ہے، دو روٹیوں کے لیے دین اور دنیا دونوں سے ہاتھ دھولیا ہے، قیامت کے روز ان کا یہ ان کے حق میں دشمن ثابت ہوگا۔

صبحدم برکف نہادم جام عشق　　تا شوم سرمست دل آرام عشق

در مشام جانم آمد بودی دوست　　چوں فلک چرخی زدم در کوی دوست

ساقی آمد جام جاں افروز داد　　بلبلاں را مژدۂ نوروز داد

عندلیب باغ شو از وصف دوست　　اہل مجلس را بروں بردہ ز پوست

ہر اک از مستی نوای ساختہ　　غلغلہ در عرش و فرش انداختہ

گرد ہستی راز دامن روفتہ　　پای ہمت ہر دو عالم کوفتہ

درمیان انس مرغان حرم　　کردہ ہنگام طواف از سر قدم

مجلس خاص است و جای عام نیست　　پختہ ای باید کہ کار خام نیست

ایں ہمہ چغدان ایں ویرانہ اند　　از نوائی بلبلاں بیگانہ اند

از تکلف خویشتن برتافتند　　ما شاء اللہ کز نشانی یافتند

خرقہ ہا را دام نغمہ ساختند　　بہر دو ناں دین و دنیا باختند

از برای نام رفتہ ننگ شاں　　خصم شاں روز قیامت رنگ شاں

اس کے بعد کتاب کا خاتمہ ہے جس میں ساقی (مرشد) سے اپنے ذوق وشوق اور طلب کا اظہار شاعرانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

ساقیا جام صبوحی در خورست　　کز مئی دوشیں مزا درد سرست

وقت آں آمد کہ در آب و گلی　　در ہوای صبحدم سازم گلی

خیز تا یکدم دو جیحوں درکشم　　خط می در رابع مسکوں کشم

گر ہمہ دریا و زورق را خودی　　باشد ایں کشتی بتابانی مری

چوں نہ دریا ماند و نی زورقت　　گوہری بخشد محیط مطلقت

عالمی بینم ز دل بیدل ہمہ　　طالب دریا و بر ساحل ہمہ

ساقیا می دہ کہ ایں افسانہ بود　　ہرچہ گفتم وصف ایں خمخانہ بود

رطل می بستان دمادم بازدہ　　پس سفیہم را ہمہ آواز دہ

گر فتوحی پر تکلف می رسد　　مدعی را کی تکلیف می رسد

در خراباتی کہ ایں مَی می دہند　　قیمت صد جاں بیک جو می دہند

شب روی کردم دریں راہِ مخوف　　تا مگر یابم بسرحد وقوف

مرکب از توفیق حق می تاختم　　جز تحیر منزلی نشناختم

چونکہ دانستم کہ حیرت در رہ است　　پس یقینم کہ خاموشی بہ است

طول عرضی خواستم ایں نامہ را　　مصلحت ناگہ شکستم خامہ را

''کنز الرموز'' کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حسینی کی ادبی اور صوفیانہ حیثیت کے بارے میں ایرانی ادیب ونقاد ڈاکٹر فروغ حکمت کا خیال نقل کردیا جائے۔

ڈاکٹر فروغ حکمت حسینی کو رومیؔ اور سعدیؔ کی صف میں کھڑا کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مغلوں کے تاخت وتاراجی کے دوران جب وسط ایشیا اور ایران کی علمی وادبی محفلوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی، امیر حسینی نے بھی آٹھویں صدی ہجری میں وہی کارنامہ انجام دیا تھا جو ساتویں صدی ہجری میں رومی اور سعدی نے انجام دیا تھا، اس پُر آشوب دور میں حسینی نے بھی اصلاح و

تربیت اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ تصوف واخلاق کی شمع کو روشن رکھا اگرچہ فکر وفن کے اعتبار سے وہ ان بزرگوں کے مرتبہ کو نہیں پہنچتے لیکن خدمات میں ان سے کم نہیں ہیں، اپنے معاصرین میں انہیں سب پر فوقیت حاصل ہے، حسینی کے مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"......باسرایشِ واسناد تاریخی وادبی او چناں می نماید کم پس از دور برگزید سخن ہای پارسی شیخ شیراز ومولانا روم در صدۂ ہفتمین اسلامی میر ہرات ہم در صدۂ ہشتمیں نہالی برومند بودہ است کہ بس از دیگر دانایانِ آں زماں ثمر ہای سودمند و آموزندہ داد"۔

ان کی نگارشات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بیشتر از گفتار ویشہای میر آمیختہ بہ اشارات بشمار از کیفیت صفات اجتماعی وخصوصیات فرہنگی وسیاسی زمان او است، از انکہ زندگانی مرد پیر خردمند از آغاز تا انجام درمیان خرابی ہای اہریمنی مغولاں بہ تیرگیہای افکار وعلوم گذشتہ است حوادث شوم آں روزگار ہمگی زندگانی مادی ومعنوی وی پیوستگی تام داشتہ خرد ودانش او عامل فرہنگی کہ دراں زماں رواج داشتہ است بر تفکر وکلام او موثر گشتہ"۔

ان کے اسلوب نگارش کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"......میر ہرات ہر چند در سبک نگارش، نگارش سہل وممتنع باسعدی برابر نمی نشنید ودر آزادگی وبی پروائی ہمپایہ مولوی نیست، بنظم ونثر او در مفہوم خاص خود وزاں دور زبان باسخنان دیگر بزرگان ادبِ معاصر او درخشندہ گوہری است کہ ارزش جاویدی دارد، پارہ ای از نوشتہا ومقالات وی در سادگی وروانی ورسائی وبیساختگی تناسب سخن پست تر از آثار مولوی نمی ماند، تا صدۂ نہمیں اسلامی جز وی جای کس دیگر نتوانست بمانند سعدی کتب گونا گوں وبسیار در رشتہ ہای فنون علمی حکمتہای عملی وعرفانی در سخنہای پیوستہ وپراگندہ گرد آورد"۔

ان اقتباسات سے امیر حسینی کے مقام ومرتبہ اور ان کی نگارشات کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا، انہیں میں ان کی مثنوی "کنزالرموز" بھی ہے جو کئی پہلوؤں سے نہایت اہم ہے:۔

۱- یہ مثنوی جیسا کہ داخلی شہادتوں سے ثابت ہے، ہندوستان میں لکھی گئی تھی اور ہندوستانی ادبیات تصوف میں بیش بہا اضافہ ہے۔

۲- اس سے حسینی کے شیخ کے تعین میں مدد ملتی ہے اور اس سلسلے کے مشائخ کے بارے میں بہت سی تاریخی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔

۳- یہ مثنوی سہروردیہ سلسلے کے اس وقت کے روحانی پیشوا شیخ رکن الدین ابوالفتح کی نظر سے گذر چکی ہے، انہوں نے ہی اس کا نام تجویز کیا تھا، لہذا اس سلسلے کے علمی وعملی نظریات تصوف کی اسے دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

۴- اس سلسلے کے صوفیانہ عقاید ونظریات کی یہ مثنوی نمایندگی کرتی ہے اور حسینی اس سلسلے کے نمایندہ شاعر ہیں نہ کہ شیخ فخر الدین عراقی جیسا کہ جدید مورخین اور محققین کا خیال ہے، عراقی "وحدت الوجود" کے مبلغ تھے، اپنی شاعری میں کھلے عام اس کی تبلیغ کرتے تھے، جب کہ اس مثنوی میں "سکر وصحو" کے باب میں اس طرح کی تبلیغ میں احتیاط کی تاکید ملتی ہے۔

عاشق انجا بس پریشانی کند — حالتش دعوی سبحانی کند

آنکہ در کوی بلا بردار بود — خستۂ ایں خنجر خونخوار بود

صد ہزار انجا نیک ساعت دو نیم — ایں محلِ آفت است و جای بیم

۵- مثنوی سے ثابت ہوتا ہے کہ سہروردیہ سلسلے کے صوفیانہ عقاید ونظریات کے زہد وتقویٰ اور احترام شریعت بنیادی عناصر ہیں، ان کے نزدیک شریعت کے بغیر طریقت بے معنی ہے، اس سلسلے کے صوفیہ علم، تحقیق اور اتباع شریعت پر زور دیتے تھے۔

۶- مثنوی کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم تیرہویں صدی کے ہندوستان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں، وحدت الوجود کا فلسفہ خانقاہوں میں زیر بحث آچکا تھا، سلطان محمد بن تغلق (م ۷۵۲ھ) کی عقلیت پسندی میں غلو کے باعث معاشرے پر شریعت کی گرفت کمزور پڑنے لگی تھی جس کا ردعمل فیروز شاہ تغلق (م ۷۹۰ھ) کی طرف سے شریعت کے نفاذ میں سختی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس دور میں جو حالات پیدا ہو گئے اس کا اندازہ شمس سراج عفیف کے اس بیان سے بہ خوبی ہوتا ہے کہ ایک مجذوب شاہی محل کے سامنے

دریائے جمنا کے کنارے وضو کر رہے تھے، وضو سے فراغت کے بعد جب کھڑے ہوئے تو محل کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ جانتے ہو اس میں کون رہتا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ اس میں وہ شخص رہتا ہے جس نے دنیا بھر کے فتنوں کو اپنے قدموں تلے دبا رکھا ہے جس دن وہ اس دنیا سے اٹھ جائے گا اس دن دنیا والوں کو اس کی قدر معلوم ہوگی، مجذوب کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی، سلطان فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک مرکزی حکومت کو استحکام نصیب نہیں ہوا، مذہبی فتنوں نے ملک کے طول و عرض میں پیر پھیلانا شروع کر دیا، ایران اور وسط ایشیائی ممالک سے آنے والے قید شریعت سے آزاد صوفیوں، مجذوبوں اور درویشوں نے پنجاب، سندھ اور گجرات میں اپنے قدم جمالیے، اس کے بعد معاشرے میں مذہبی، اخلاقی اور روحانی قدروں کا جو حال ہوا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، اس صورت حال کے مقابلے کے لیے حسینی اور سہروردیہ سلسلے کے دوسرے صوفیہ نے زبان و قلم کا سہارا لیا، حسینی نے جو کچھ لکھا وہ وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق تھا، اس کا مقصد تصوف کو بدعتوں سے پاک کرنا اور شریعت سے اس کے کمزور ہوتے ہوئے رشتوں کو مستحکم کرنا تھا، اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم حسینی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کی عظمت اور ان کی کاوشوں کی قدر و قیمت ہماری نظروں میں بڑھ جاتی ہے، مذکورہ مثنوی ادبی خصوصیات کی بھی حامل ہے، استعارے اور کنایے میں انہوں نے تصوف کے رموز و نکات کو نہایت سادہ اور رواں اسلوب میں بیان کیا ہے، بعض مصرعے اور اشعار ضرب المثل کا حکم رکھتے ہیں، اگر حسینی پر باقاعدہ تحقیقی کام کیا جائے تو اس عہد کے مذہبی اور معاشرتی زندگی کے بعض نئے گوشوں کو تاریخ کی روشنی میں لایا جا سکتا ہے۔

استدراک

مضمون کی تکمیل کے بعد "معارف"، اعظم گڑھ کی پرانی فائلوں کی ورق گردانی کے دوران اس کے مارچ ۱۹۳۵ء کے شمارے میں "گل ملتانی" کے عنوان سے اسد ملتانی کا مضمون نظر سے گذرا، جس میں انہوں نے "رکن عالم" کے مقبرے کے بارے میں لکھا تھا کہ فیروز شاہ تغلق نے بنوایا تھا، اس کی تردید میں گورنمنٹ کالج جھنگ (پنجاب) کے پروفیسر شیخ عنایت اللہ نے لکھا (نومبر ۱۹۳۵ء)

کہ مقبرہ محمد بن تغلق کا بنوایا ہوا تھا، ثبوت کے طور پر شیخ جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظ "جوامع العلوم" کے اردو ترجمہ کا حوالہ دیا ہے، مجھے "جوامع العلوم" اور اس کا ترجمہ دستیاب نہ ہو سکا لیکن اگر شیخ جہانیانی جہاں گشت کے الفاظ وہی ہیں جو صاحب مضمون نے نقل کیا ہے تو "رکن عالم" سے ان کی مراد رکن الدین بن عالم رہی ہوگی نہ کہ رکن الدین ابوالفتح، پیر و مرید کے ناموں کی یکسانیت سے مضمون نگار حضرات کو اشتباہ ہوا ہے، شیخ جہانیانی جہاں گشت حسینی کے معاصر اور شیخ رکن الدین ابوالفتح کے مرید اور خلیفہ تھے، ملفوظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے "رکنی عالم" محمد بن تغلق کے بنوائے ہوئے مقبرے میں مدفون ہیں، وہ الفاظ کہے ہیں جیسا کہ اس جملے سے ظاہر ہے، میں زیارت کو وہاں نہیں جاتا کیوں کہ "رکن عالم" وہاں نہیں ہیں، شیخ رکن الدین ابوالفتح اپنے دادا شیخ بہاؤالدین زکریا کے پہلو میں مدفون ہیں اور رکن الدین بن عالم کا مزار ہرات میں ہے، ان کا سن وفات شیخ جہانیانی جہاں گشت ۷۳۵ھ بتاتے ہیں جو زیادہ مستند و مصدقہ ہے کیوں کہ وہ ان کے معاصر تھے۔

حوالے

۱ تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۴۰۶۔ ۲ سیر العارفین، ج ۱، ص ۲۵۔ ۳ کیٹلاگ آف اودھ لائبریری، ص ۴۳۰۔ ۴ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر خلیق نظامی، صباح الدین عبدالرحمن وغیرہ نے اپنی اپنی کتابوں میں یہی نام لکھا ہے۔ ۵ نزہت الارواح، ص ۱۴۶۔ ۶ ایضاً ص ۱۴۸۔ ۷ ایضاً مجتبائی پریس، دہلی۔ ۸ زاد المسافرین (قلمی)، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ۔ ۹ سیر العارفین، ج ۱، ص ۲۵۔ ۱۰ رہنمائے کتاب، ج ۷، حصہ اول، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹-۳۰۔ ۱۱ تاریخ فیروز شاہی، برنی، ص ۳۹۶۔ ۱۲ تذکرۃ الشعراء، دولت شاہ سمرقندی، ص ۲۲۴
۱۳ Some aspects religion and Polities during Twenteen Cent, Nizami.
۱۴ Glimpses on Medeval Indian Cultuer, Ysuf Husain Khan. ۱۴ نفحات الانس، ص ۳۹۵۔ ۱۵ تذکرۃ الشعراء، ص ۲۲۴۔ ۱۶ ہفت اقلیم، ج ۲، ص ۱۲۵۔ ۱۷ شرح حالات و آثار، امیر حسینی ہروی، مائل ہروی، نفحات الانس میں دیے ہوئے سن وفات کو کندہ کرا کے کتبہ بہت بعد میں نصب کیا گیا ہوگا۔ ۱۸ زاد المسافرین کا سن تصنیف ۷۲۹ھ ہے، زاد المسافرین (قلمی)، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ۔ ۱۹؎ رہنمائے کتاب، ج ۷، حصہ اول، (ایران) ۱۹۶۴ء، ص ۲۹-۳۰-۳۱، نیز دیکھیے ''استدراک''۔ ۲۰؎ گلشن راز (قلمی)، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۲۱؎ رہنمائے کتاب، ص ۳۰-۳۱

غیاث دولت و دیں راشب و روز ...... خدا داند کہ می باشم دعا گوی
کہ چنداں آرزو منداست دل را کہ کلک و کاغذ نمی گنجد دراں کوی
دریں دریا کہ قعرش نا پدید است نشاں خود ز نام و ننگ می جوئی

۲۲؎ دیکھیے میرا مضمون ''نزہت الارواح''، انڈو ایرانیکا، کلکتہ، ستمبر ۱۹۶۳ء۔ ۲۳؎ ذخیرہ سبحان اللہ، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں موجود یہ مخطوطہ نہایت قدیم معلوم ہوتا ہے لیکن ناقص ہے کیوں کہ انتخاب میں جو اشعار ہیں ان میں سے بیشتر اس میں نہیں لیے گئے ہیں، اسی طرح صرف شہاب الدین سہروردی کی شامل ہے۔ ۲۴؎ خوش خط ہے لیکن انتخاب ہے اور موضوع عنوانات کے تحت ہیں، اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ ۲۵؎ شرح حال و آثار، امیر حسینی غوری ہروی، مائل ہروی۔ ۲۶؎ ایضاً۔ ۲۷؎ ایضاً۔ ۲۸؎ فرشتہ ۶۷۶ھ، سفینۃ الاولیا اور مراۃ الاسرار ۶۸۴ھ بتاتے ہیں۔ ۲۹؎ مخطوطہ میں شمس الدین ہے جو غالباً کاتب نے اس مصرع سے اخذ کیا ہے ''شمس ملت آسمان سروری'' جب کہ اس سے قبل کے شعر میں ''رکن'' سے اشارہ رکن الدین کی طرف ہے۔

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت

از ڈاکٹر سید اختیار جعفری☆

اردو ادب نے فارسی کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور اپنے ابتدائی عہد میں اسی کے زیر سایہ ترقی کی منزلیں طے کیں اور اسی کے نمونے اردو ادب کے سامنے تھے، فارسی روایات سے اس نے بہت کچھ حاصل کیا، ابتدائی عہد میں ہی فارسی میں شعرا کے متعدد تذکرے لکھے جا چکے تھے، چنانچہ اردو کے تذکرہ نویسوں نے فارسی کی تقلید کی اور فارسی کے تذکروں کو نمونہ بنایا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو معایب یا محاسن فارسی تذکروں میں پائے جاتے تھے، کم و بیش وہی روایات اردو تذکروں میں بھی راہ پا گئیں، یہی وجہ ہے کہ ان تذکروں میں عہد حاضر کی سی تنقید کے نمونے نہیں ملتے کیوں کہ ہر عہد کے تنقیدی معیار اور اصول مختلف رہے ہیں[۱]۔

تذکرہ دراصل بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے، بیاض کو ہم ادبی ڈائری کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، قدیم زمانے میں پڑھے لکھے لوگ عام طور پر بیاض رکھا کرتے تھے، اس بیاض میں بعض گھریلو اندراجات کے علاوہ ضروری یادداشتیں، نسخے، اعمال و اوراد کے ساتھ ساتھ منتخب اشعار بھی ہوتے تھے، بعض بیاضوں میں صرف اپنے پسندیدہ شاعر کا نام، تخلص، دیوان کا نام اور اس کے منتخب اشعار یا غزلیں لکھی جاتی تھیں، ایسی ہزاروں قلمی بیاضیں آج بھی مشرقی علوم کے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔

بیاض دراصل عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں سفید اور سادہ، چونکہ یہ ذاتی ڈائری یا نوٹ بک سادہ کاغذوں سے بنتی تھی، اس لیے ڈائری کو بیاض کہنے لگے جو افراد ادبی و شعری ذوق رکھتے تھے وہ اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب تیار کر لیتے تھے، اس زمانے میں چھاپے خانے نہیں تھے، عوامی کتب خانے بھی نہیں تھے، کتب فروش بھی کم تھے اور کتاب کی نقل بھی بہت مہنگی تیار ہوتی

☆ ۱۸/۱۴۷، اے، ۲۶، خیرادی ٹولہ، تاج گنج روڈ، آگرہ۔

تھی، اس لیے بہت سے شاعروں کے دیوان رکھنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں تھا، اس بنا پر بیاض اور انتخاب والا طریقہ اختیار کیا گیا۔[۲]

بیاض کی ترقی یافتہ صورت تذکرہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے، جسے اہل زبان یادداشت، دستاویز، سرٹیفکیٹ یا ٹکٹ اور پاسپورٹ وغیرہ کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن اردو میں اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختلف حالات اور ان کا نمونۂ کلام جمع ہوتا ہے، ڈاکٹر مجید بیدار کا خیال ہے کہ

> ''اصولی طور پر تذکرہ ذکر کے معنی سے مربوط ہے، عربی سے اردو میں مروج ہونے والا یہ لفظ مجرد حیثیت سے اردو میں رواج پاگیا اور فارسی کے زیر اثر اردو ادب میں اس لفظ کو صنف کی حیثیت حاصل ہوئی، عام انداز میں تذکرہ بہ معنی ذکر کے مروج ہے لیکن اصطلاحی اعتبار سے تذکرہ متعدد اشخاص کے حالات اور کارناموں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی شہادت دیتا ہے، یعنی تذکرہ ایک ایسی صنف ہے، جس میں فن کے جلیل القدر اصحاب کی سوانح اور انفرادی خصوصیات کو واضح کیا جاتا ہے، اس اعتبار سے تذکرہ کا فن ایک کتاب کا محتاج ہوتا ہے یعنی جب تک کئی اہم شخصیتوں کو مربوط نہ کیا جائے۔ اس کی حیثیت تذکرہ کی نہ ہوگی، اس فنی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کے فن کے لیے سب سے بڑی ضرورت اشخاص کے حالات اور ان کے کارناموں کو جمع کرکے اسے کتابی شکل دینا ہے، جب تک اس اصول کی تکمیل نہیں ہوگی کوئی بھی تحریر شدہ متن تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جائے گا''۔[۳]

مروجہ اصطلاحی معنی میں صرف وہی کتابیں تذکرہ کی تعریف میں آتی ہیں، جن میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں، دوسرے الفاظ میں یہ دونوں عناصر مختصر حالات اور منتخب کلام، اس صنف ادب کے لیے ناگزیر ہیں جن کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا، حالات کے تحت تذکرہ نگار شعرا کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام، علمی و فنی استعداد، شاگردی و استادی کے روابط، مزاج و طبیعت کی افتاد، تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے مذاق و معیار کے متعلق ابتدائی قسم

کی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے، نمونہ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفرق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی کبھی دوسری اصناف سخن کے اقتباسات بھی پیش کیے جاتے ہیں، ترتیب کے اس بنیادی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے اگر کسی کتاب میں محض ہر شاعر کے نام اور تخلص کے ساتھ مختلف شاعروں کا کلام یکجا کردیا جائے تو اسے تذکرہ کے بجائے ''بیاض'' کہا جائے گا، جب کہ زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعہ اور کلام کے متعلق بحث کی صورت میں ایسی کتاب ''تاریخ ادب'' کی تعریف میں آئے گی۔[۴]

اس وقت تذکروں میں سب سے زیادہ صحت زبان، محاورات اور صنعتوں کے استعمال، متروکات، فصیح و غیر فصیح اور الفاظ اور ترکیبیں، ابہام اور دوسرے نقائص و محاسن شعری کو دیکھا جاتا تھا اور یہی اس وقت کی تنقید تھی جس میں ان کا ذوق سخن، سلیقۂ شعری، فارسی اساتذہ کے کلام کا مطالعہ و وجدان رہنما ہوتا تھا، میر نے اپنے شاعرانہ نظریات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن وہ اتنا مختصر ہے کہ اس پر اس عہد کے نقد شعر کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، پھر بھی میر کی بے لاگ تنقید کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے، وہ تنقید خواہ سخت یا تلخ ہی کیوں نہ ہو لیکن وہی تنقید کی رہنما اور رہبر بنی۔[۵]

ڈاکٹر مجید بیدار[۶] نے اردو تذکروں کو درج ذیل طریقوں میں تقسیم کیا ہے:۔

۱-مذہبی تذکرے، ۲-ادبی تذکرے، ۳-سماجی تذکرے، ۴-انسائیکلوپیڈیائی تذکرے، ۵-صنفی تذکرے، ۶-آئینی تذکرے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے تذکروں کی حسب ذیل تقسیم روا رکھی ہے:۔

۱-اول وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کی مستند حالات جمع کیے گئے ہوں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے، ۲-وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت اور استیعاب ہے، ۳-وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرائے کلام کا عمدہ اور مفصل انتخاب پیش کرنا ہے، ان میں حالات جمع کرنے کی طرف زیادہ اعتنا نہیں ہے، ۴-وہ تذکرے جن میں اردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقا دکھانا ہے، ۵-وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں، ۶-وہ تذکرے جو کسی وقتی یا ادبی گروہ کے نمائندہ ہیں۔ ۷-وہ تذکرے جن کا مقصد تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے۔[۷]

لیکن ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مطالب کی نوعیت کے بجائے مولفین کی حیثیت کے لحاظ سے تذکروں کے تین درجات قایم کیے۔

۱-وہ تذکرے جو کسی بڑے شاعر کے قلم کا نتیجہ ہیں، ۲-وہ تذکرے جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں لیکن کسی بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد تھے، ۳-وہ تذکرے جن کے مصنفوں کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہا جاسکتا ہے۔

اس کے برخلاف ڈاکٹر حنیف نقوی نے تمام اردو تذکروں کی ان کے اغراض و مقاصد یا معنوی اعتبارات کے لحاظ سے حسب ذیل طریقے سے درجہ بندی کی ہے:-

۱-تعارفی تذکرے: وہ تذکرے جن کے لیے مولفین نے علمی و ادبی ذوق یا جذبۂ قدر شناسی کے تحت شعرا کے حالات یا اشعار کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور علی العموم بے جا تنقیص و تعریض سے دامن بچائے رکھا ہے۔

۲-جوابی تذکرے: وہ تذکرے جن کے مولفین نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی ضد میں قلم اٹھایا ہے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں حریف تذکرہ نگار کے بیانات کی تردید یا اپنے احباب کی تعریف و تحسین اور مخالفین کی تشہیر و تضحیک پر صرف کردی ہیں، قطب الدین باطنؔ اکبرآبادی کا تذکرہ گلستانِ بے خزاں اسی ضمن میں آتا ہے۔

۳-انتخابی تذکرے: وہ تذکرے جن میں انتخابِ کلام اور تدوینِ اشعار کو حالات زندگی کی تلاش و ترتیب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے، اس قسم کے تذکروں کی مثال حیدر بخش حیدریؔ کے گلشنِ ہند، بینی نرائن جہاںؔ کے دیوانِ جہاں اور شاہ کمال کے مجمع الانتخاب کو پیش کیا جاسکتا ہے۔[۸]

تذکرے ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں، ان میں اس عہد کی نہ صرف ادبی بلکہ سماجی، ثقافتی اور قدرے سیاسی حالات کی تصویرکشی کی گئی ہے، زبان و ادب کے ارتقا اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ان کی اہمیت اور افادیت کا دائرہ بہت وسیع ہے، شعرائے اردو و فارسی کے جو تذکرے ہندوستان میں مرتب ہوئے ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے، ان میں سے بہت سے اہم تذکرے مثلاً "مجمع النفائس"، "نغز الکلمات"، "جام جہاں نما"، "نشترِ عشق"، "تذکرۂ قدرت"، "تذکرۂ خیراتی لال بے جگر"، "انیس الاحباب"، "آفتاب عالم تاب" اور "بحر زخار" وغیرہ آج تک شایع نہیں ہوسکے، ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ تذکرہ نویسی کے میدان میں ہندو مصنفوں کی خدمات بہت نمایاں ہیں، ان تذکرہ نگاروں میں لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی کا نام قابل ذکر ہے، اس کے یہاں تلاش و تحقیق کا رجحان ہے، تنوع ہے، فنی واقفیت ہے اور اس کے تذکروں میں اتنی معلومات مل جاتی ہیں جو اس زمانے کی ادبی تاریخ لکھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں، وہ چونکہ علامہ غلام علی آزادؔ بلگرامی کا شاگرد ہے اس لیے تذکرہ نویسی میں بھی اپنے استاد کی پیروی کرتا ہے، لالہ خوب چند ذکاؔ، خیراتی لال بے جگر، موہن لال انیسؔ، بینی نرائن جہاںؔ، درگا پرشاد نادر کھتری، راجہ جنم جی متراؔ، گوکل پرشاد رساؔ، بندرابن خوشگو، بھگوان داس ہندیؔ، آنند رام مخلصؔ سے ہوتی ہوئی یہ روایت لالہ سری رام اور پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی پر آکر ختم ہوگئی تھی، اب مالک رام صاحب نے "تذکرہ معاصرین" لکھ کر یہ سلسلہ آگے بڑھایا ہے، چندر پرکاش جوہر بجنوری بھی قابل ذکر ہیں۔

حوالے

۱؎ ڈاکٹر نیاز سلطان پوری "اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد"، مکتبہ دین و ادب لکھنؤ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۔
۲؎ پروفیسر نثار احمد فاروقی "شعرائے اردو کے تذکرے" "مضمون مشمولہ" سہ ماہی سابرنامہ، گجرات اردو اکاڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۔ ۳؎ ڈاکٹر مجید بیدارؔ "دکنی تذکرے" ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۔ ۴؎ ڈاکٹر حنیف نقوی "شعرائے اردو کے تذکرے" (نکات الشعراء سے گلشنِ بے خار تک) نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۔ ۵؎ ڈاکٹر شارب ردولوی "جدید اردو تنقید: اصول و نظریات" اترپردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۵۔ ۶؎ ڈاکٹر مجید بیدار ایضاً (مقدمہ) ص ۸۷۔ ۷؎ ڈاکٹر سید عبداللہ، بحوالہ ڈاکٹر حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، ص ۴۴۔
۸؎ ڈاکٹر حنیف نقوی، ایضاً ص ۵۰۔

☆☆☆

اخبار علمیہ

جنوری ۲۰۰۳ء کے آخر میں سید ابراہیم (۱۸۹۷-۱۹۹۴ء) کے ثلث، نسخ، تعلیق، ریحانی اور محقق وغیرہ خطاطی کی مختلف قسموں پر مشتمل متعدد تحریری نمونوں کی پیرس میں نمائش ہوئی جس میں وہ مخطوطات بھی تھے جو انہوں نے د... ویز کے طور پر بیرون ملک بھیجے تھے، چنانچہ بنگلور کی جامع مسجد میں بھی ان کا ایسا مخطوطہ آیا تھا، مصری تہذیب وثقافت کے کونسلر ڈاکٹر ہانی ہلال نے مصر، فرانس، عرب اور ... وسرے ملکوں کے خطاطی ومصوری کے شیدائیوں کی موجودگی میں نمائش کا افتتاح کیا، ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء میں IRCICA کا پانچواں خطاطی مقابلہ اسی ماہر فن خطاط کے نام سے منسوب اور اس سلسلہ میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ہوا تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے شہر ڈنڈی میں اسلام اور عربی مطالعہ وتحقیق کے لیے حال ہی میں المکتوم انسٹی ٹیوٹ قایم ہوا ہے جس کا مقصد درس وتحقیق کے میدان میں مناسب افراد کی تیاری اور تربیت ہے، یہ ادارہ خود مختار اور آزاد ہے اور یکم نومبر ۲۰۰۱ء سے ابرٹی یونیورسٹی، ڈنڈی کے اسکول آف سوشل اینڈ ہیلتھ سائنسز کے ایک شعبہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے، متحدہ عرب امارات میں مالیات اور صنعت کے وزیر اور ڈپٹی رولر آف دبئی ہمدان بن رشید المکتوم کی توجہ اور فراہم کردہ رقم کے سبب اس کو کافی فروغ حاصل ہوا، اسکاٹ لینڈ کی ممتاز شخصیت اور سابق وزیر سیاحت وکلچر لارڈ واسٹن اس ادارہ کے چانسلر رہ چکے ہیں، گو ادارہ کی داغ بیل ۲۰۰۰ء میں ہی پڑ چکی تھی لیکن اس کے اکیڈمک منصوبوں کا افتتاح اگست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء میں ہوا، یہ ادارہ ایک پی-جی سنٹر کی حیثیت سے طلبہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی تفویض کرتا ہے اور یونیورسٹی آف ابرٹی، ڈنڈی میں رائج دوسرے کورسوں کے اسناد بھی یہاں سے دی جاتی ہیں، انسٹی ٹیوٹ کے تین تحقیقی مرکز ہیں: ۱-دی سنٹر آف اسلامک یروشلم اسٹڈیز، ۲-دی سنٹر فار ایڈیٹنگ عربک ٹکسٹس اینڈ مینسکرپٹس، ۳-دی سنٹر فار دی اسٹڈیز

آف اسلام اینڈ مسلم ان اسکاٹ لینڈ انسٹی ٹیوٹ یروشلم کے مسئلے سے لوگوں کو بہتر طریقہ سے واقف کرانے کے لیے "مطالعات اسلامی یروشلم" پر زیادہ زور دے رہا ہے۔

شہر ایس، اینجیلو، اٹلی میں ۱۶؍ دسمبر ۲۰۰۱ء سے ۱۸؍ فروری ۲۰۰۲ء تک جاری نمائش میں عراقی خطاطوں کے ایک گروپ نے اپنے سنہرے اور تاباں تحریری نمونے پیش کیے، بعد میں نمائش میں روم کو لے کر تین مزید شہروں کے نمایندوں نے بھی شرکت کر کے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ثلث، نسخ، اجاز، تعلیق، دیوانی، جلی دیوانی، رقعہ اور طغریٰ وغیرہ چالیس سے زیادہ خطاطی کے نمونے پیش کیے، نمائش میں حصہ لینے والے ماہرین فن میں عبدالحسین الرکابی، عبدالرضا الکرمیلی، اکرم جرجیس، علی، احمد، امیر الجبومیلی، خلیل الضحاوی، فراس عباس، حیدر ربیع، فرح عمار، خلیل الواسطی، محاء الحمودی، محمود لطفی، محمد ہاشم، صدیق الدری، وسیم، شوکت اور سلیمان ابراہیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ (نیوز لیٹر)

شاہ فہد پرنٹنگ پریس مدینہ منورہ میں شیخ خلیل خضری کی آواز میں تیار کیے گئے آڈیو کیسٹ اب تمل زبان میں ترجمے کے ساتھ دست یاب ہیں، تمل ترجمہ مولانا اسماعیل امدادی نے مولانا مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن سے کیا ہے اور اس کے اجرا کا سہرا اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ چینئی (مدراس) کے سر ہے، اس کے علاوہ تفہیم القرآن کی تلخیص، امہات المومنین از عبد الحفیظ رحمانی اور سیرت پر ڈاکٹر جمال بداوی کی کتاب کا تمل ترجمہ بھی شایع کیا گیا ہے۔

امام ابوجعفر احمد بن نصر الداؤدی کی کتاب الاموال اسلامی اقتصادیات ومعاشیات کے اصولوں، خمس، فے، غنائم، زکوۃ وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہے، اس کے مخطوطات دنیا کے متعدد اہم کتب خانوں میں موجود ہیں، ابوالحسن محمد شرف الدین نے تحقیق، تخریج اور تعلیق کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اور مترجم نے اپنے پیش نظر نسخہ کا مقابلہ میڈرڈ کی ایسکوریل لائبریری میں موجود نسخہ سے کیا ہے، ڈھاکہ یونیورسٹی نے اس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی، ۴۱۵ صفحات پر مشتمل اس محقق نسخہ کو ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے شایع کیا ہے، اس کی قیمت ۳۰۰؍ روپے ہے۔

انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ملیشیا کے شعبۂ نفسیات کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی

کے عنوان سے ۴-۶؍ اگست "کانفرنس "مسلمان اور اسلام اکیسویں صدی میں تصور اور حقیقت
۲۰۰۴ء کو ہوگی، ذیلی عنوانات میں "دہشت گردی کا مفہوم اور اس کی قسمیں، امت مسلمہ کے اتحاد
کے لیے لائحہ عمل اور اس سلسلہ میں میڈیا کا کردار، انسانی حقوق مسلم معاشرہ میں، خواتین کے
مسایل، اسلام اور جمہوریت وغیرہ قابل ذکر ہیں، مقالات کا خاکہ جمع کرنے کی آخری تاریخ
۳۱؍ اکتوبر ۲۰۰۳ء تھی اور مقالہ جمع کرنے کی تاریخ ۳۰؍ اپریل ۲۰۰۴ء ہے، کانفرنس کے لیے منتخب
مقالہ نگاروں کو ۳۱؍ دسمبر ۲۰۰۳ء تک مطلع کردیا جائے گا، کانفرنس کی مزید تفصیلات جاننے کے
لیے درج ذیل ویب سائٹ اور ای میل ایڈرس سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

ttP://ii u. edu. my/PSYCONF 2004

ای میل: Psyconf 2004 @ iiu. Deu. my

برل اکیڈمک پبلشرز لائیڈن نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی گیارہ جلدیں اور انسائیکلو پیڈیا آف قرآن کی دو جلدیں شایع کرنے کے بعد چھ جلدوں پر مشتمل "انسائیکلو پیڈیا آف ویمنس اینڈ اسلامک کلچرز" کے عنوان سے شایع کیا ہے، ہر جلد بے شمار ذیلی عنوانات پر مشتمل اور جدید ترین تحقیق و اطلاع پر مبنی ہے، ایک ہزار سے زاید محققین نے اس انسائیکلو پیڈیا کی تیاری میں خون جگر صرف کیا ہے، کیلیفورنیا یونیورسٹی، ڈیوس کے سعاد جوزف اس کے اڈیٹر ہیں، معاون مدیروں میں پانچ خواتین جین آئی سمتھ، جاکلین سیانیو، سیٹینی شامی، جولی پٹیٹ اور افسانہ نجم آبادی شامل ہیں۔

ک، ص اصلاحی

شعر العجم حصہ اول تا پنجم (مکمل سیٹ)

مرتبہ: علامہ شبلی نعمانیؒ

اس میں فارسی شاعری کی تاریخ، ابتدا، عہد بہ عہد کی ترقیوں اور خصوصیات وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ سامانی دور سے تیموری دور تک کے ممتاز شعرا کا مفصل تذکرہ اور ان کی شاعری پر تبصرہ و تنقید ہے۔

قیمت =/۲۳۳ روپے

معارف کی ڈاک

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر ورک شاپ اور پاکستان میں دار المصنفین کی مطبوعات کی غیر قانی اشاعت

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،
اسلام آباد، پاکستان
۴؍ دسمبر ۲۰۰۳ء

محترمی و مکرمی جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب زادمجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ برکاتہ

امید ہے مزاج مبارک بخیر ہوگا، آپ کا گرامی نامہ محررہ ۱۰؍ ستمبر ۲۰۰۳ء بروقت موصول ہوا، اس کے ساتھ ہی "دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات" پر آپ کا گراں قدر ہدیہ بھی عنایت ہوا، اس کرم نوازی اور شفقت کے لیے تہِ دل سے شکر گزار ہوں، جواب میں قدرے تاخیر ہوئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، میں چاہتا تھا کہ "یادگار شبلی" لاہور سے خرید کر ارسال کروں گا تو اس کے ساتھ ہی خط لکھوں گا، گذشتہ دنوں لاہور جانا ہوا، ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے "یادگار شبلی" کا نیا اڈیشن خریدا، آپ کے لیے پیش خدمت ہے۔

ہمارے وائس چانسلر محترم پروفیسر ڈاکٹر سید الطاف حسین صاحب ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی علمی و دینی حدمات پر دو تین روزہ ورک شاپ یا سمپوزیم رکھنا چاہتے ہیں، امید ہے یہ ورک شاپ جنوری یا فروری میں ہو، ہمارے ڈین کلیہ محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر چشتی صاحب نے

فرمایا کہ اس موقع پر آپ اسلام آباد تشریف لائیں اور اس ورک شاپ میں مہمان خصوصی ہوں، یونیورسٹی ہر طرح کی خدمت پیش کرے گی، آپ کی آمد ہمارے لیے صد افتخار ہے۔

''دارالمصنفین'' عالم اسلام کا معروف ادارہ ہے اور اس کی کم زور مالی حالت پڑھ کر سخت صدمہ ہوا، یہاں پاکستان کے پبلشرز دارالمصنفین کے رفقا کی زندگی بھر کی محنت و تحقیق کا سرمایہ اور ادارہ کی مطبوعات شایع کر کے مال دار بن رہے ہیں، غیر قانونی طور پر دارالمصنفین کی کتب شایع ہو رہی ہے، اگر یہ سب ادارے اور پبلشرز رائلٹی دیں یا کچھ دارالمصنفین کی مدد کر دیں تو ادارہ کی حالت بہتر ہو سکتی ہے، یہاں کے ہر مشہور ادارے و پبلشرز نے ''سیرت النبیؐ''، ''تاریخ اسلام''، ''سلسلہ صحابہ و صحابیات'' جیسی کتب وغیرہ شایع کی ہیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد سے کوئی معاہدہ کیا تھا کہ دارالمصنفین کی کتب پاکستان میں نیشنل بک فاؤنڈیشن شایع کرے گا مگر اب ہر ادارہ شایع کر رہا ہے، اس سلسلے میں آپ یہاں کے ذمہ داران کو متوجہ کر سکتے ہیں، صدر پاکستان یا وزیر اعظم کو لکھ سکتے ہیں۔

میں نے یہاں اسلام آباد کے چند احباب سے دارالمصنفین کے حوالے سے بات کی تو وہ بھی مدد کا ارادہ رکھتے ہیں، کوئی زیادہ مال دار تو نہیں مگر حسب توفیق جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے، آپ کی پاکستان آمد سے اس مہم کو مزید تقویت پہنچے گی۔

دارالمصنفین کی مطبوعات کی فہرست جو آپ نے ارسال کی ہے، اس میں سے ''سلسلہ اسلام اور مستشرقین'' کا مکمل سیٹ، ''تذکرہ محدثین'' مکمل سیٹ، ''تذکرۂ مفسرین ہند'' مکمل سیٹ ارسال کر دیں، اس کے عوض آپ جو حکم دیں تعمیل ہوگی۔

احباب کی خدمت میں سلام۔

والسلام مع الاحترام۔

محتاجِ دعا

محمد سجاد

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامیات)

میر درد پر مضمون

جی-۴۷، سفینہ اپارٹمنٹ،
میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ
۲۵ر نومبر ۲۰۰۳ء

مخدوم مکرم السلام علیکم

''معارف'' کے نومبر کے شمارے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کا مقالہ ''میر درد اور علم الکتاب'' نظر نواز ہوا، فاروقی صاحب نے تصوف کے بارے میں میر درد کے بیان کا جو خلاصہ دیا ہے، اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور اس کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا ہوا لیکن انہوں نے آخر میں جو تبصرہ کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

''……انہوں (درد) نے کتاب و سنت کے حوالے سے نیا طریقہ ''محمدیہ'' قایم کر کے اس کے اصول و قواعد اور امتیاز کا اظہار کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے مگر اس میں ان کا ذہن واضح نہیں ہے اور معلوم نہیں ہوتا کہ ''محمدیین الخالصین'' کے علم کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جائے، کیوں کہ ترجیح بغیر مرجح کے معتبر نہیں ہوتی''۔

کتاب لکھنے کا سبب تو فاروقی صاحب نے درست بیان کیا ہے لیکن اس کے آگے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید ان کے دیے ہوئے خلاصے ہی میں موجود ہے، میر درد نے صوفیہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، پہلی قسم تو انہوں نے ان صاحب مواجید و احوال اور اعمال و اشغال کی بتائی ہے جنھیں تحقیق و معرفت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، دوسری قسم ان کے نزدیک محقق صوفیہ کی ہے، تصوف دراصل انہی کی تحقیقات سے عبارت ہے، وہ موخر الذکر کو اول الذکر پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ موخر الذکر اہل علم اور صاحب تحقیق ہیں اور تصوف درد کے نزدیک انہیں کی تحقیقات سے عبارت ہے، پھر موخر الذکر کے بارے میں بھی ان کا کہنا ہے کہ ان کا علم بھی اضافی علم ہوتا ہے، انہوں نے کچھ اصطلاحیں وضع کر لی ہیں اور اشراقین کی طرح اپنے مطالب کو انہیں اصطلاحوں پر

منطبق کرتے رہے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک محمدیوں کو ان پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کہ محمدیوں کا علم خالص علم حقیقی ہے، کیوں کہ وہ زبان مصطفوی میں کلام کرتے ہیں (وضع کردہ اصطلاحوں میں نہیں) اور مطالب کو اسی نہج پر بیان کرتے ہیں جو نفس الواقع ہیں، محمدیوں کا کلام سراسر کلام اللہ کی تفسیر ہوتا ہے اور قول رسول اللہ اس پر گواہ ہوتا ہے، اب اس سے زیادہ ذہن واضح کیا ہوسکتا ہے، پتہ نہیں فاروقی صاحب کی مرجح سے کیا مراد ہے اور وہ اس کے کیا معنی لیتے ہیں

فاروقی صاحب نے میر درد پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے ''وحدت الوجود'' کے ماننے والوں کو کم عقل کہا ہے اور یہ کہ ابتدائے سلوک میں یہ مقام مبتدیوں کے سامنے آتا ہے، اس سے کم فہم عوام کو نقصان پہنچتا ہے، انہوں نے اس میں شیخ محی الدین ابن العربی کا بھی حوالہ دیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ فلسفہ ''وحدت الوجود'' کو ابن العربی سے منسوب کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے، یہ فتنہ ان کے شارحین کا پھیلایا ہوا ہے جو اشراقیت سے متاثر تھے، اسلامی تصوف میں اس فلسفہ کو بنیاد بنانے والے شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول تھے، اس سے پہلے اسلامی تصوف کی بنیاد شریعت محمدی تھی جس سے سرمو انحراف بھی ضلالت و گمراہی تھی، ابتدائی مشائخ کو عباد و زہاد کہا جاتا تھا اور ریاضت و عبادت اور بے نفسی تصوف کے ذیل میں آتا تھا، صوفی اور تصوف کی اصطلاح کا اطلاق بعد میں ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ''وحدت الوجود'' پر تنقید کرنے میں درد پہلے شخص نہیں ہیں، ان سے پہلے بھی بعض صوفیہ نے اس پر اظہار خیال کیا ہے، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے یہاں ''وحدت الوجود'' کے بارے میں تو کچھ نہیں ملتا لیکن صاحب سیر الاولیا کے بیان کے مطابق انہوں نے منصور حلاج کو مردود قرار دیا تھا۔

سہروردی سلسلے کے صوفی شاعر امیر حسینی نے اسے ''محل آفت'' سے تعبیر کیا ہے۔

حال مستی دار ملک ابتناست   مہرہا در ششدرہ و بازی خطاست
ایں قدح را ہم دل بینا کشد   تشنہ باشد گرچہ صد دریا کشد
حالتش دعوی سبحانی کند   عاشق اینجا بس گرانجانی کند
خستۂ ایں خنجر خونخوار بود   آنکہ در کوی بلا بردار بود

ایں محل آفتست و حامی بیم   صد ہزار اینجا بیک ساعت دو نیم

شیخ مجدد الف ثانی نے اس فلسفہ کی رد میں ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا، عبدالقادر بیدل جو اپنے وقت کے عارف کامل تھے، ''وحدت الوجود'' کے فلسفہ کی سختی سے مخالفت کی ہے، دو شعر پر اکتفا کرتا ہوں:۔

آں کیست شود محرم اظہار و خفاست   آئینہ خویشند عیان ہا و نہان ہا
ما را چہ خیالست آب جلوہ رسیدن   او ہستی و ما نیستی اور حجلہ و ما ہیچ

اقبال جنہوں نے ایرانی مابعد الطبیعات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جرمنی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی اس فلسفہ کو مسلمانوں کے سیاسی زوال کا سبب ٹھہرایا ہے، اسلامی معاشرے پر اس کے جو مضر اور منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کا اندازہ کرنا ہو تو ہندوستان میں سیدوں اور لودیوں اور اورنگ زیب کے بعد مغل ادوار کی تاریخ کا مطالعہ کافی ہوگا۔

مجھے سخت حیرت ہے کہ ''وحدت الوجود'' کے دفاع میں فاروقی صاحب جیسا فاضل شخص بھی وہی غیر منطقی تاویل پیش کر رہا ہے جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں مفتیوں کے احتساب سے بچنے کے لیے اس کے ماننے والے صوفیہ پیش کرتے تھے، سوال یہ ہے کہ جب یہ فلسفہ عوام کے لیے نہیں تھا تو عوام میں پھیلا کیسے اور کس نے پھیلایا؟ کیا دنیا میں ایسا کوئی مذہب، کوئی تحریک، کوئی فلسفہ ایسا ہے جو صرف چند مخصوص لوگوں کے لیے تھا، تصوف کا ادنا طالب علم بھی اس امر سے آگاہ ہے کہ صوفیہ کے اعمال و اشغال اور ان کے نظریات سے ان کے مریدین ذہنی طور پر متاثر ہوتے تھے اور ان کی تقلید کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

خط طویل ہوگیا ہے، ختم کرتا ہوں ورنہ کہنے کو بہت کچھ ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ آپ بعافیت اور تندرست ہوں گے، علی گڑھ آنے پر ضرور مطلع فرمائیں ورنہ آپ سے شکایت ہوگی

نیاز مند

محمد معتصم عباسی آزاد

پس از تحریر: فاروقی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر درد کا طریقہ یا سلسلہ ان کی زندگی تک

چلا پھر معدوم ہوگیا، غنیمت ہے کہ ان کا تو سلسلہ ہی معدوم ہوا، بیدل کی تو قبر تک معدوم ہوگئی جس پر ان کے شاگرد سودا کے زمانے تک عرس مناتے تھے، دہلی میں سینکڑوں اولیاء اللہ کے مزار ہیں صرف ایک بیدل کا مزار معدوم ہو جانا بڑا معنی خیز ہے، واقعہ یہ ہے کہ بیدل اور میر درد نے پیری مریدی کا سلسلہ نہیں چلایا تھا، البتہ شاعری میں ان کے شاگرد ضرور تھے، ان دونوں کا مقصد صرف رایج الوقت تصوف کی اصلاح و تطہیر تھا، دونوں اپنے اپنے وقت کے صوفی اور عارف کامل تھے، بیدل علما کے سوا اور صوفیان خام کا دشمن تھے، یہی وجہ ہے کہ بہ حیثیت شاعر ہی انہیں دیس نکالا دے دیا گیا تھا، وہ افغانستان اور وسط ایشیا میں مقبول ہوئے، تقریباً دو سو سال بعد جامعہ ملیہ میں قمر غفار نے پہلی بار بیدل پر سمینار کرایا، وہ بھی بہت محدود تھا۔

دار المصنفین کا سلسلۂ مکاتیب

مکاتیب شبلی حصہ اول: مرتبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے ان خطوط کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے اور جن میں ملکی، قومی، مذہبی، علمی مسایل اور علامہ کے اصلاحی خیالات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ **قیمت ۴۰؍ روپے**

مکاتیب شبلی حصہ دوم: مرتبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے ان خطوط کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے نام لکھے اور جن میں زیادہ تر ان کے علمی، تعلیمی اور اصلاحی خیالات درج ہیں۔ **قیمت ۳۵؍ روپے**

برید فرنگ: از مولانا سید سلیمان ندویؒ، وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے جب سید صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں سے ہندوستان کے اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو جو خطوط لکھے، یہ ان کا مجموعہ ہے جو بڑا معلومات افزا اور دنیائے اسلام کے اکابر رجال سے ان کی ملاقاتوں کی دل چسپ روداد ہے۔ **قیمت ۳۵؍ روپے**

مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی: یہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام مولانا الطاف حسین حالی، میر اکبر حسین الہ آبادی، مہدی حسن افادی، سید حسین بلگرامی، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولانا ابو الکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کو دار المصنفین نے اہتمام سے شایع کیا ہے۔ **قیمت ۴۵؍ روپے**

ادبیات

رباعیات

از جناب وارث ریاضی صاحب☆

مفلس ہو، گدا ہو کہ ہو وہ صاحب جاہ
ہر ایک کو ہے دولت بسیار کی چاہ
دولت کی ہوس حق سے ہٹا دیتی ہے
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

دنیا کی ہر اک چیز ہے آنی جانی
جاوید جو سمجھے اسے، ہے نادانی
وہ رونق گل ہو کہ ستاروں کی ضیا
"اللہ بود باقی و باقی فانی"

دنیا ہے حسیں اس سے مگر دل نہ لگا
اس شاہد رعنا کے تو دھوکے میں نہ آ
وہ جو بھی رہا گیسوے دنیا کا اسیر
اس کو غم و حرماں کے سوا کچھ نہ ملا

دنیا تو بہت جاذب دل ہے لیکن
بھولے سے اسے اپنے رفیقوں میں نہ گن
جس پر بھی کرم کرتی ہے ڈس لیتی ہے
اے دوست، یہ دنیا ہے اک ایسی ناگن

اشرار کو اخیار سمجھنے والے
فجار کو ابرار سمجھنے والے
رہتے ہیں سدا احمقوں کی دنیا میں
ظلمات کو انوار سمجھنے والے

خود غرض کو غمخوار سمجھ بیٹھا ہے
ظالم کو نکوکار سمجھ بیٹھا ہے
بہتی ہے ترے شہر میں الٹی گنگا
دنیا کو وفادار سمجھ بیٹھا ہے

دنیائے محبت کا مزا چکھا ہے
دل میں غم و اندوہ سجا رکھا ہے
جو عشق کی الجھن سے الگ ہے وارث
وہ آدمی دنیا میں بہت اچھا ہے

ہماری مقامی زبان میں، گِن گاف کے کسرے کے ساتھ مستعمل ہے۔

☆ کاشانۂ ادب، سکھا، دیوراج، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

مطبوعات جدیدہ

حضرت امیر شریعت، نقوش و تاثرات: مرتبہ جناب مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۵۱، قیمت درج نہیں، پتہ: دارالاشاعت رحمانی، پو ۰۹، مونگیر، بہار ۸۱۱۲۰۱۔

۱۹۹۱ء میں مولانا سید منت اللہ رحمانی کا انتقال ہوا تو اسلامی ہند میں صف ماتم بچھ گئی، عام احساس تھا کہ مولانا کی جامع، متحرک اور دردمند شخصیت کا دور قحط الرجال میں اٹھ جانا ایک نعمت خداوندی سے محروم ہوجانا تھا، دیوبند وندوہ، امارت شرعیہ، مسلم پرسنل لابورڈ، مسلم مجلس مشاورت اور خانقاہ رحمانی سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا، ان کی شخصیت اصلاً آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، حق تھا کہ ان کے سوانح اسی پس منظر میں مرتب کیے جائیں، چند رسایل کے خاص شماروں سے یہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی، زیرنظر مجموعۂ مضامین بھی شاید اسی احساس کے پیش نظر شایع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصحاب فکر ونظر کی قریب پچاس سے زاید تحریریں آگئی ہیں، مولانا حامد الانصاری، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مالک رام، سید حامد، نثار احمد وشمس الرحمن فاروقی، اخلاق الرحمن قدوائی، پروفیسر نذیر احمد، قاضی اطہر مبارک پوری، خواجہ حسن ثانی نظامی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی وغیرہ مشاہیر اور مدیر معارف کے مضامین نے اس مجموعہ کو یک گونہ تنوع اور جامعیت عطا کی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دینی تشخص کے قیام واستحکام میں مولانائے مرحوم کی خدمات کے ضمن میں لکھا کہ دور انحطاط میں باب اجتہاد کا کھولنا، حیات اجتماعی کی بربادی کے مترادف ہوجاتا ہے، فتنہ تاتار کے بعد باب اجتہاد بند کیے جانے کو انہوں نے نفسیات عمرانی پر علما

کی گہری نظر کا ثبوت قرار دیا ہے لیکن چند صفحات کے بعد جناب سید حامد نے اپنی تحریر میں امیر شریعت کی بیدار مغزی اور صلابت فکر کی داد میں خود مولانا کی یہ رائے نقل کی کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہوگا اس کے بغیر ہماری مشکلات کا حل شاید نہ ہوسکے کیوں کہ آج بھی ایسے مسایل ہیں جن میں تمام فقہا کی فقہ خاموش ہے، چند مضامین میں مولانا کی روحانیت کا ذکر ہے، کرامتیں بھی منقول ہیں، ص ۵۰۸ پر ایک روایت واقعی عجیب وغریب ہے، مولانا کی قلمی خدمات پر بھی ایک مفید مضمون ہے، اس مجموعے میں ترتیب نظر نہیں آتی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قاضی مجاہد الاسلام اور خود مولانا ولی رحمانی کی تحریروں کی عدم شمولیت باعث حیرت ہے۔

اقوال سلف حصہ پنجم وششم: از جناب مولانا محمد قمرالزماں الہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد، صفحات ۱۲۷، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دارالمعارف بی ۹۶/ ۶۳، وصی آباد، الہ آباد-یوپی۔

علما ومشائخ کرام کے اقوال واحوال کے جمع وتالیف کے اس مفید ومبارک سلسلے کے چار حصوں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، اب حصہ پنجم وششم کی جلد میں شاہ وصی اللہ الہ آبادی سے قاری صدیق احمد باندوی تک ۱۸۷ اصحاب علم وعرفان کے احوال جمع کیے گئے ہیں، اس سے اخذ وترتیب میں فاضل مولف کی محنت اور حسن ذوق وانتخاب کا اندازہ ہوتا ہے، یہ احتیاط قابل لحاظ ہے کہ صرف ان بزرگوں کا انتخاب کیا گیا جن کے عقیدہ وعمل کے بارے میں علمائے حق کو پورا اطمینان واتفاق رہا ہے، باطنی حالات ومقامات وکرامات کی تفصیل سے بھی گریز کیا گیا ہے، مقصد ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کی زندگی اوران کے احوال وارشادات سے ملی زندگی میں اصلاح حال کی سعی کی جائے، فاضل مولف خود حضرت مصلح الامت کے خلیفہ راشد ہیں، ان کے مختصر حواشی وافادات نے اس پورے سلسلے کو حد درجہ مفید وموثر بنادیا ہے، پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ یہ سلسلہ صرف اقوال سلف کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ تذکرۃ الاخیار بھی ہے۔

مغربی تہذیب انحطاط کی شاہراہ پر: از جناب اکرام اللہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۳۳۶، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ اودھ بک سنٹر ۹۶/۱۳۰، گنیش گنج، لکھنؤ اور الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ ومکتبہ جامعہ دہلی وغیرہ۔

فیشن پرستی کی آڑ میں دنیائے مغرب نے جس طرح اپنے معاشرے کو ناپاک اور جنس لطیف کو بازاری شے بنادیا ہے وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں، سیرت و اخلاق کی بربادی، عفت وعصمت کے فطری قوانین کی پامالی اور عائلی زندگی کی شکست وریخت کی ایسی مثال شاید پوری انسانی تاریخ میں ملنا مشکل ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورت حال مغرب کے ان نام نہاد دانش وروں کی ہے جنہوں نے شاخ نازک کے اپنے آشیانوں میں مادیت کے نشے میں بدمست ہوکر ہر عیب کو ہنر بناکر دکھانے کی مذموم کوششیں کیں، گو اس نقار خانے میں چند دوسری آوازیں بھی اٹھتی ہیں، زیر نظر کتاب میں مغربی تہذیب کے اسی چہرہ کو زیادہ قریب سے دیکھا گیا ہے جس پر برق و بخارات کا ملمع ایسا گہرا ہے کہ اس کی مکروہ حقیقت عموماً مخفی رہتی ہے، اس سلسلے میں سوربون یونیورسٹی میں مسز اندرا گاندھی کا یہ جملہ نقل کرنے کے لایق ہے کہ تمدن کا موجودہ بحران، کلچر کے تصادم سے نہیں بلکہ تشدد سے ہے صرف وہ تشدد نہیں جو آتشیں اسلحہ جات سے پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ تشدد جو عام لوگوں کے برتاو اور ان کی بے رحمی سے جھلکتا ہے، لایق مصنف نے اس سے پہلے بھی فریب تمدن، دلوں کی خیر اور نشے کی لت جیسی مفید کتابوں سے مغربی تہذیب کی ہولناکیوں سے روشناس کیا ہے، یہ کتاب بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے جس میں خاص طور پر مغربی فحاشی کے محرکات اور نتایج بد کا مدلل و مفصل جایزہ لیا گیا ہے، مقصد واضح ہے کہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں، محاسن کی قبولیت جس طرح جایز ہے، معائب سے کنارہ کشی بھی اسی درجہ واجب ہے، مولانا سید محمد رابع ندوی کے الفاظ میں یہ مفید کتاب دراصل خواص اور اہل علم کے پڑھنے کے لایق ہے جو اس کی بنیاد پر معاشرے کی اصلاح کے کام میں مدد لے سکتے ہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی: مرتبہ ڈاکٹر آدم شیخ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۵۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲ - دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی اور مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ممبئی اور علی گڑھ۔

مہاجرین، سیر الصحابہ، تابعین، تاریخ اسلام، دین رحمت، حیات سلیمان اور ادبی نقوش کے مصنف و مولف اور معارف کے مدیر کی حیثیت سے شاہ معین الدین احمد ندوی کو اردو ادب و تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے، ان کو بجا طور پر گوہر شب چراغ کہا گیا، ان کی ذات سے دارالمصنفین کی وقعت و حرمت میں اضافہ ہوا، ذاتی لحاظ سے وہ صوفیانہ روایتوں کی علامت تھے، متانت و شرافت، وضع داری وخودداری، ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے، ان کا انتقال ہوا تو ندوہ کے رسالہ تعمیر حیات نے ایک خاص شمارہ شایع کیا، معارف میں سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے ایک مبسوط مضمون بھی سپرد قلم کیا لیکن ان کی ایک جامع و مبسوط سوانح عمری کی ضرورت بہر حال ہے، اس کتاب کے فاضل مولف کو احساس رہا کہ شاہ صاحب کی علمی و دینی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے، چنانچہ انہوں نے قریب پندرہ مضامین کو یکجا کرکے زیر نظر کتاب کی شکل دی اور ایک اہم علمی ضرورت کی تکمیل اس امید کے ساتھ کی کہ یہ دارالمصنفین اور اس کے قدردانوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی، اس توقع میں ہم بھی شریک ہیں۔

گجرات کے علمائے حدیث وتفسیر: از جناب محبوب حسین احمد حسین عباسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۵۱، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ۴/۱اے، ششی پارک مقابل ظرف ڈیری، سرخیز روڈ، پوسٹ جوہاپورہ، احمد آباد، گجرات ۳۸۰۰۵۵۔

ہندوستان میں علوم اسلامیہ خصوصاً تفسیر وحدیث کے فروغ واشاعت میں گجرات کا ذکر خاص طور پر نہایت نمایاں ہے، نویں اور دسویں صدی ہجری میں تو یہ ریاست، مرکزیت کی حامل ہوگئی، امام سخاوی وابن حجر مکی کا فیضان علم یہاں قابل رشک حد تک جاری ہوا، ہندوستان میں صحیح بخاری کی سب سے قدیم شرحوں کی ترتیب کا فخر بھی اسی خطہ برکات کو حاصل ہوا، اس امتیاز کی وجہ، عرب ملکوں سے مکانی قربت سے زیادہ اس ریاست کے سلاطین و امرا کی علم پروری رہی، ان نو مسلم سلاطین نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں فیاضی اور داد و دہش کی مثالیں قایم کردیں، عرب ملکوں سے مضبوط رشتوں کی بنیاد کے متعلق فاضل صاحب کتاب نے صحیح لکھا کہ یہ حکومت اور سیاست سے زیادہ تجارت، ثقافت اور تعلیم وتعلم پر رکھی گئی تھی جس کے اثرات گجرات کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے مخفی نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ درحقیقت عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت، سلاطین گجرات کی قسمت میں تھی، مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمن،

علی متقی کی تفسیر شئون المنزلات اور شریحی کی کاشف الحقائق اور علم حدیث میں الفیض النبوی، کنزالعمال، مجمع بحارالانوار اور تذکرۃ الموضوعات سے سب واقف ہیں لیکن علوم اسلامیہ کا ایک بڑا خزینہ اب بھی وہاں کے کتب خانوں میں مستور ہے، اس خزینہ کی یافت میں زیر نظر مختصر مگر حد درجہ تحقیقی کتاب ایک اہم کلید کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ۸۰۰ھ سے ۱۳۰۰ھ تک یعنی پانچ سو سال پر محیط قریب ۶۸ علمائے گجرات کی تفسیری وحدیثی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے، مخطوطات کہاں کہاں موجود ومحفوظ ہیں، اس کی نشان دہی بڑی اہم ہے، فاضل محقق نے اس کے لیے قدیم وجدید مراجع اور خاص طور پر کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ کی وضاحتی فہرستوں سے مدد لی ہے، ان کے حواشی سے ان کی سخت محنت کا اندازہ ہوتا ہے، مفسرین ومحدثین کے حالات میں اختصار کے ساتھ جامعیت کا توازن بڑا خوش گوار ہے، کتاب کا انتساب بجاطور پر فاضل محقق ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم سے کیا گیا۔

مطالعۂ دینیات اسلام: از ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۱۸، قیمت ۶۰ روپے، طلبہ کے لیے ۵۰/روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

قرآن وحدیث، سیرت، شریعت، فقہ اور معاشرتی واخلاقی تعلیمات جیسے موضوعات پر جدید عصری تقاضوں اور نئے ذہنوں کے لیے اس کتاب میں مدلل اور منطقی اسلوب میں گفتگو کی گئی ہے، نوجوان اور لائق مصنف نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ان طلبہ کی دشواریوں کا مشاہدہ کیا ہے جو گریجویشن کی منزلوں میں اسلام کے عقاید، احکام اور ان کے اصول ومبادی کے متلاشی رہتے ہیں، کتاب کے اسلوب وانداز میں اس رعایت کی جھلک ہے اور اس خوبی سے ہے کہ یہ دوسروں کے لیے بھی بڑی مفید ہوگئی ہے، قرآن مجید اور احادیث شریفہ کے جمع وتدوین کی بحث میں مخالفین کے اعتراضات کا جواب، غزوات کا جواز، فقہ اور مکاتب فقہ کی ضرورت اور نکاح وطلاق کے اسلامی قوانین کی مصلحت وغیرہ مباحث کو اچھی طرح پیش کیا گیا ہے۔

ع-ص

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

...وۂ صحابہؓ (حصہ اول): اس میں صحابہ کرامؓ کے عقاید، عبادات، اخلاق ومعاشرت کی تصویر پیش ...ی گئی ہے۔
قیمت ۵۰/روپے

...وۂ صحابہؓ (حصہ دوم): اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔
قیمت ۵۶/روپے

...وۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰/روپے

...رت عمر بن عبدالعزیزؒ: اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی ...ارناموں کا ذکر ہے۔
قیمت ۳۲/روپے

...م رازیؒ: امام فخرالدین رازیؒ کے حالات زندگی اور ان کے نظریات وخیالات کی مفصل تشریح ...ئی ہے۔
(زیر طبع)

...ائے اسلام (حصہ اول): اس میں یونانی فلسفہ کے ماخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور ...ویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔
قیمت ۱۵۰/روپے

...ائے اسلام (حصہ دوم): متوسطین ومتاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۴۰/روپے

...رالہند (حصہ اول): قدما سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے ...ور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔
قیمت ۸۰/روپے

...رالہند (حصہ دوم): اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی ...ی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔
قیمت ۷۵/روپے

...یخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ...ی گئی ہیں۔
قیمت ۱۲۵/روپے

...ب الامم: سر تطور الامم کا انشا پردازانہ ترجمہ۔
قیمت ۵۵/روپے

...ت عبدالسلام: مولانا مرحوم کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ۔
قیمت ۶۰/روپے

...کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ وشاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔
قیمت ۷۵/روپے

....